مجاز

حیات و خدمات

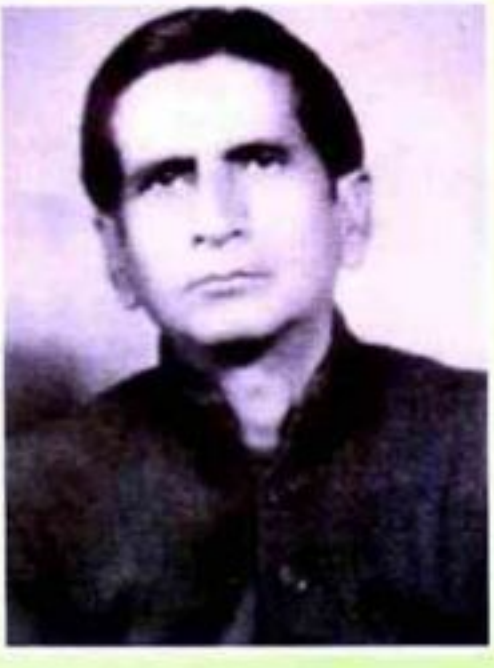

مرتبہ
ڈاکٹر رضا حیدر

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

مجاز

حیات وخدمات

https://www.urdubooks.acw-614.com

مجاز

حیات و خدمات

مرتبہ:
ڈاکٹر رضا حیدر

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

(©جملہ حقوق محفوظ)

Majaz : Hayat o Khidmaat
Edited By:
Dr. Raza Haider

ISBN 81-8172-067-9

اہتمام : شاہد ماہلی

سنہ اشاعت : ۲۰۱۴ء

قیمت : ۱۵۰/روپے

مطبوعہ : اصیلا آفسیٹ پریس، نئی دہلی

غالب انسٹی ٹیوٹ،
ایوانِ غالب مارگ، نئی دہلی۔۲
www.ghalibinstitute.org -- E-mail: ghalib@vsnl.net

فہرست

پیش لفظ

۱۔ مجاز، ایک افسانے کی یاد	شمیم حنفی	۹
۲۔ مجاز شناسی کے باب میں	عتیق اللہ	۱۵
۳۔ مجاز	کمال احمد صدیقی	۲۷
۴۔ مجاز اور شامِ غریبانِ لکھنؤ	عابد سہیل	۴۵
۵۔ مجاز۔ شاعرِ محفلِ وفا اور مُطربِ بزمِ دلبراں	کشمیری لال ذاکر	۵۵
۶۔ مجاز کی شاعری کا ابتدائی دور	علی احمد فاطمی	۶۳
۷۔ انقلاب کا مطرب: مجاز	علی جاوید	۸۴
۸۔ ''مجاز۔ ایک مطالعہ''	فیاض رفعت	۹۳
۹۔ مجاز کی شاعری اور شخصیت کے چند پہلو	خالد علوی	۱۰۱
۱۰۔ مجاز کی مزین معنویت اور مقصدیت	ریاض قدوائی	۱۱۹
۱۱۔ مجاز کی غزل	سراج اجملی	۱۲۷

۱۲۔ مجاز بحیثیت ترقی پسند شاعر	راشد انور راشد	۱۳۴
۱۳۔ مجاز تنقید کے چند حوالے	سرور الہدیٰ	۱۴۱
۱۴۔ مجاز کا تخلیقی سفر اور علی گڑھ	نفیس بانو	۱۵۴
۱۵۔ مجاز کی ترقی پسند غزلیہ شاعری	صالحہ زرین	۱۶۵
۱۶۔ ارمانوں اور مسرتوں کا شاعر اسرار الحق مجاز	افسانہ پروین	۱۷۶
۱۷۔ مجاز رومانیت اور انقلاب کا مطرب	فرحت زہرا	۱۸۵
۱۸۔ مجاز کا تصورِ انقلاب	رضا حیدر	۱۹۶

پیش لفظ

غالب انسٹی ٹیوٹ نے تقریباً ۴۰ برسوں سے سو سے زیادہ قومی اور بین الاقوامی سمینار کا انعقاد کیا ہے۔ ادارے نے نہ صرف غالب پر متعدد مذاکرے کا اہتمام کیا بلکہ میر تقی میر، سودا، مصحفی، خان آرزو، خواجہ میر درد، بہادر شاہ ظفر، میر انیس، مرزا دبیر، مومن خاں مومن، ذوق، تفتہ، خان آرزو، قائم چاند پوری، علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی اور شاد عظیم آبادی کے علاوہ اردو اور فارسی ادب کے ممتاز ادیبوں اور دانشوروں کے علمی کارناموں پر سمینار کا انعقاد کیا ہے۔ ان تمام سمیناروں کی خاصیت یہ رہی ہے کہ ہم ان کے تمام مقالات کو فوراً ہی کتابی شکل میں علمی اور ادبی دنیا میں پیش کر دیتے ہیں تاکہ ہمارے اساتذہ، طلبا، ریسرچ اسکالر اور علم و ادب سے وابستہ حضرات ان کتابوں سے مستفید ہو سکیں۔

ہم نے گذشتہ سال اسرار الحق مجاز پر ایک بڑے سمینار کا انعقاد کیا تھا جس میں دلّی اور بیرونِ دلّی کے اہم علماء و اساتذہ نے شرکت کی اور مجاز کی زندگی اور شاعری سے متعلق اپنے گرانقدر خیالات پیش کیے۔

مجاز کی شاعری کی جہاں بے شمار خصوصیات ہیں وہیں ان کی شاعری میں بدلتے ہوئے اقدار کی سیاسی، سماجی، رومانی، انقلابی ہر سطح پر ایک نئی فضا اور ایک نئی لے کے ادراک کا احساس ہوتا ہے۔ مجاز نے بہت کم عمر پائی، ان کا شعری سرمایہ بھی زیادہ نہیں ہے، زندگی میں ہر طرح کی پریشانیوں کا بھی سامنا کیا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے غزل

کے دامن کو وسیع کیا اور جو راستہ اُن کے ہمعصر بڑے شاعروں نے اپنایا تھا اس میں تازگی اور وسعت بھی پیدا کی۔

مجاز نے نظمیں بھی کہیں، اُن کی نظموں میں رومانی عنصر زیادہ حاوی تھا لیکن جب مجاز کے شعور میں پختگی آئی اور انہوں نے زمانے کے بدلتے ہوئے مزاج کو دیکھا تو وہ اپنے آس پاس کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مجاز نے وقت کی ضرورت کو محسوس کیا اور اپنی شاعری کو ملک کی تحریک آزادی سے وابستہ کیا۔

اس کتاب میں شامل تمام مضامین ایسے ہیں جن میں مجاز کی زندگی اور اُن کی شاعری پر ہمارے ادبا نے نہایت ہی مدلل، معنی خیز اور فکر انگیز گفتگو کی ہے۔ ہم پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر عتیق اللہ، جناب عابد سہیل، ڈاکٹر کشمیری لال ذاکر، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر علی جاوید، جناب فیاض رفعت، ڈاکٹر خالد علوی، جناب ریاض قدوائی، ڈاکٹر سراج اجملی، ڈاکٹر راشد انور راشد اور ڈاکٹر سرور الہدیٰ کے شکر گزار ہیں جنہوں نے اس مذاکرے میں شرکت کی۔ ہمیں یقین ہے کہ ان تمام حضرات کے مقالات سے اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہوگا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر کمال احمد صدیقی کا بھی مضمون ہے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، اُن کی کمی ہمیں ہر وقت محسوس ہوتی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے تمام جلسوں میں وہ بڑی دلچسپی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ اُن کے بھی مضمون سے ہمیں ضرور روشنی ملے گی۔

ہم پروفیسر عتیق اللہ کے بھی شکر گزار ہیں جنہوں نے مجاز سمینار میں کلیدی خطبہ پیش کیا تھا۔ پروفیسر عتیق اس عہد کے بڑے دانشور اور نقاد ہیں اُن کی تمام تحریریں ہمارے لئے سند کا درجہ رکھتی ہیں، اس کتاب میں شامل آپ کا مضمون بھی مجاز شناسی میں ہمارے لئے معاون ثابت ہوگا۔

شاہد ماہلی

شمیم حنفی

مجاز، ایک افسانے کی یاد

مجاز کا خیال ہمیں اپنی روایت کے ایک معمار سے زیادہ اس روایت سے منسلک ایک افسانے کے طور پر آتا ہے۔ اس افسانے کے ظہور پر آدھی صدی سے زیادہ کا وقت گزر چکا ہے، پھر بھی اس کی کشش اور دلاویزی اب تک قائم ہے۔ مجاز کے معروف ہندستانی معاصرین میں جذبی، سجاد ظہیر، مخدوم، وامق، نیاز حیدر، سردار جعفری، کیفی، مجروح، ساحر بھی رخصت ہو چکے۔ اب لکھنؤ میں بھی مجاز کے نام لیوا بس گنتی کے رہ گئے ہیں۔ ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ! مگر ایک بھرے پُرے دور کے خاتمے کے باوجود، مجاز کی زندگی کا افسانہ ان تمام لوگوں کی زندگی کا حصہ ہے جنھوں نے قریب و دور سے مجاز کو دیکھا تھا یا ان کی باتیں سنی تھیں۔ یوں بھی، مجاز کی شاعری سے زیادہ ان کی شخصیت توجہ کا مرکز بن گئی تھی اور خود مجاز کو بھی یہ اندازہ ہو چلا تھا کہ اپنی ادبی تاریخ اور روایت سے زیادہ مستحکم اور مقبول حیثیت، انہوں نے اپنی تہذیبی اور سماجی زندگی میں حاصل کر لی ہے۔ اس کا نقصان مجاز کی شاعری نے بھی اٹھایا اور ان کی تابناک، ایک شعلۂ مستعجل کی سی کیفیت رکھنے والی ہستی نے بھی۔

مجاز کی ذہنی تربیت جس ادبی اور تخلیقی معاشرے میں ہوئی تھی، اُس کے عناصر اور

آثار کا وہ خاصا رچا ہوا شعور رکھتے تھے۔ ہر چند کہ انہیں مسلم لیگ کی سیاست سے بھی کچھ دنوں تک دل چسپی رہی اور اُنہوں نے اپنی اُس دور کی سیاسی سوجھ بوجھ کے مطابق ایک ترانہ بھی لکھا، لیکن یہ واردات بھی ان کی شاعری سے زیادہ ان کی سوانح کے ایک بھولے بسرے اور دھندلے سے دور کا حصّہ ہے۔ مجاز کی شاعری کے سیاسی رخ سے زیادہ روشن جہتیں ان کے معاشرتی اور تہذیبی شعور سے نکلتی ہیں۔ مثال کے طور پر، مجاز کے مختصر شعری سرمائے پر نظر ڈالی جائے تو ہماری توجہ کا مرکز بالعموم وہی اشعار بنتے ہیں جن میں یا تو مجاز کی زندہ تہذیبی اور وجودی شخصیت کا اظہار ہوا ہے، یا پھر ان کے عہد کی اداسی فرسٹریشن اور اضمحلال کا۔

اک نشترِ زہر آگیں رکھ کر نزدیک رگِ جاں بھول گئے

-

سب کا تو مداوا کر ڈالا، اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
اور سب کے تو گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

جیسے مصرعے اور شعر بہ ظاہر ہنسوڑ اور زندہ دل دکھائی دینے والے ایک فرد کی اداسی اور تنہائی کے ترجمان بن گئے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی سب سے نمائندہ تخلیق نظم ''آوارہ'' ہے جو مجاز کی اپنی شخصیت کو عبور کرتی ہوئی ایک پورے عہد کی بے سروساماں نسل کا افسانہ بن گئی ہے۔

''آوارہ'' اپنے حدود (Limitation) کے باوجود، اُس دور کی سب سے معروف نظموں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ مجاز کی فکر کا دائرہ اس نظم میں بہت چھوٹا سا ہے اور اس پر ایک خاص طرح کی رومانیت اور معصومانہ جوش کی فضا چھائی ہوئی ہے۔ نظم کی اٹھان میں جو غم آلود کیفیت اور جو ٹھہراؤ ملتا ہے وہ بتدریج زائل ہوتا گیا ہے اور اپنے اختتام تک پہنچتے پہنچتے مجاز کے لہجے اور آہنگ پر ایک ہسٹیریائی اور مجنونانہ شدت پسندی غالب آگئی ہے۔ شروع اور اخیر کے یہ بند دیکھیے:

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میرے سینے پر مگر چلتی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے، کون سمجھے جی کا حال
اے غم دل

اور اب نظم کے اختتامیے میں سے یہ تین بند دیکھیے:

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غم دل

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں

کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل
بڑھ کے اس اندر سبھا کا سازوساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطان پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

قطع نظر اس کے کہ اخیر کے تین بندوں میں نوچ لوں، توڑ دوں، پھونک دوں کی تکرار نے نظم کے ابتدایئے کی مدھم اور فکر انگیز غنائیت کو منتشر کر دیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ مجاز کی حسیت کسی گہری اور پائدار سوچ کا بوجھ سنبھالے رہنے کے بجائے یہاں تک آتے آتے تھک سی گئی ہے اور وہ نظم کے مرکزی خیال کی توسیع سے زیادہ نظم کو ایک منطقی انجام تک پہنچانے کی جلدی میں ہیں۔ نوجوانی کی عمر کے جذبوں اور رومانی طرزِ احساس کی ایسی ہی کیفیت، مجاز کے جونیئر معاصر ساحر لدھیانوی کی نظموں میں بھی عام ہے، مگر ساحر کی چھوٹی بڑی، حتیٰ کہ پرچھائیاں جیسی طویل نظم میں بھی کہیں جذباتی عجلت پسندی اور فکر کے بحران کا رنگ نہیں ابھرتا۔ ساحر اپنی عام ذہنی، جذباتی اور حیاتی سطح سے اوپر نہ اٹھیں جب بھی ان کے یہاں تجربے اور خیال کی تنظیم میں بالعموم فرق نہیں آتا۔ اسی لیے ساحر کے اشعار اور نظموں کی جمالیاتی کشش بھی ہمیشہ برقرار رہتی ہے اور وہ ہمیں اپنی اثر آفرینی کے لحاظ سے آگے دکھائی دیتے ہیں۔

''تلخیاں'' کی جیسی مقبولیت، ایک فیض کے استثنا کے ساتھ، ان کے کسی بھی ہم عصر کے شعری مجموعے کو نہیں ملی۔ اپنی تعلیم اور تربیت کے اعتبار سے مجاز کا مرتبہ ساحر کے مقابلے میں ذرا بھی کم نہ تھا، مگر مجاز کا المیہ یہ ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو وہ پوری طرح بروئے کار نہ لا سکے۔ مجاز کی موت پر غالباً اثر (لکھنوی) صاحب نے اس طرح کی ایک رائے

ظاہر کی تھی کہ ''اردو شاعری میں ایک کیٹس پیدا ہوا تھا جسے بھیڑیے اٹھا لے گئے''۔ ظاہر ہے کہ اُن کے اس تاثر میں بھی مبالغے اور جذباتیت کی لے تیز ہے، اور جن حالات میں مجاز کی موت واقع ہوئی، ان پر اس قسم کے کسی ردِعمل پر ہمیں حیران نہیں ہونا چاہیے۔۔ لیکن مجاز کی شخصیت میں کیٹس کی جیسی جذباتی تنظیم اور تہذیب تو دور کی بات ہے، وہ اپنے شعور کی کلاسیکی جہتوں اور اپنی فطرتی تخلیقیت کے عناصر سے بھی ویسا کام نہ لے سکے جس کی توقع ان سے بجا طور پر کی جا سکتی ہے۔ وہ آپ اپنے ''مذاقِ طرب آگیں'' کے شکار ہو گئے۔

مجاز کے بارے میں ایک مختصر سی تعزیتی تحریر کے یہ کچھ اقتباس ملاحظہ ہوں۔ تحریر محمد حسن عسکری کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''یہ بڑا ظلم ہے کہ مجاز کے انتقال پر ان کی یاد میں مضمون لکھا جائے اور ان کی شخصیت کا بھرپور تذکرہ نہ کیا جائے۔ بہت سے ادیب ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا ادب ان کی شخصیت پر حاوی آجاتا ہے اور ہم ان کی شخصیت سے دل چسپی لیتے ہیں تو ان کی تخلیقات کے طفیل لیکن مجاز نے کچھ ایسی طبیعت پائی تھی یا بنالی تھی کہ ان کی طرف متوجہ ہونے کے لیے ان کے کلام سے واقف ہونا ضروری نہ تھا۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی شخصیت ان کے اوپر اس طرح غالب آئی کہ آخر میں ان کی شاعری کو ختم کر کے رکھ دیا۔
>
> --
>
> .....بعض دفعہ ادیب ایسی چیز لکھ جاتا ہے جس کی اہمیت خالص ادبی قدر و قیمت کے ماورا ہوتی ہے، مثلاً وکتر یوگو کا ناول ''لے مرزارایل'' یا رومین رولاں کا ناول ''ژاں کرستوف'' ان

کتابوں میں ادبی اعتبار سے بیس خرابیاں نکالی جاسکتی ہیں مگر اس
کے باوجود اپنے زمانے کے چند رجحانات کی نمائندگی کرنے کی
وجہ سے Myths کا درجہ اختیار کر گئی ہیں۔"

مجاز کی نظم "آوارہ" بھی، اس سچائی کے باوجود کہ اس میں "لے مرزابل" یا "ژاں کرستوف" کی سی جذباتی گہرائی اور فکری پختگی نہیں ہے، ایک نمایاں اسطوری جہت (Mythical dimention) رکھتی ہے۔ اس نظم میں مجاز کے اپنے موڈ کے ساتھ ساتھ ان کے گردوپیش کی اجتماعی زندگی نے شاعری کی ردا اوڑھ لی ہے۔ آوارہ کے اختتامیے کو چھوڑ کر، جہاں ذہنی تجربے کی دہشت اور ہولناکی نے ایک نیم ہذیانی رنگ اختیار کرلیا ہے، اس نظم کے مجموعی آہنگ کے علاوہ وہ خود شاعر کی حسّی کیفیتوں اور نظم کی معنوی فضا میں ایک ایسی افسردہ ساماں نغمگی اور دھیما پن ملتا ہے جو پڑھنے والے کے احساسات کو بتدریج اپنی گرفت میں لیتا جاتا ہے اور ہم کچھ دیر کے لیے اس نظم کے سحر میں کھو جاتے ہیں۔ یہی حال مجاز کے کچھ غزلیہ اشعار کا ہے جو اپنے کلاسیکی رچاؤ، اپنی خوش آہنگ تراکیب اور اپنی سادگی کے باعث "شورشرابے" کی شاعری کے ماحول میں ایک منفرد تجربے کی ترسیل کرتے ہیں۔ اس نوع کا منتخب کلام مجاز کی شاعری سے ہماری شناسائی کا وسیلہ بنتا رہے گا، مگر ان کی زندگی کے افسانے میں جو ارضیت اور اداسی ہے اور مجاز کی شخصیت میں ان کی ظاہرہ زندہ دلی اور برجستگی کے باوجود، جو متانت آمیز کشش ہے وہ ہمیشہ باقی رہے گی اور ہر محفل میں انہیں محبت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔

عتیق اللہ

مجاز شناسی کے باب میں

گذشتہ دنوں میں ایک لمبے سفر تھا۔ اسی اثنا میں پانچ سات روز قبل میرے عزیز دوست جناب شاہد ماہلی، ڈائرکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ کا یہ محبت آمیز حکم نامہ ملا کہ اسرار الحق مجاز کے فکر وفن پر مجھے کلیدی خطبہ پیش کرنا ہے۔ میں ممنون ہوں کہ ارباب انسٹی ٹیوٹ نے مجھے اس اعزاز کے لائق سمجھا۔ میرے لیے مشکل یہ تھی کہ اور بہتوں کی طرح مجاز میرے لیے بھی ایک بھولا ہوا سبق ہیں۔ بھولا ان معنوں میں کہ درمیان میں ایک طویل Missing Link حائل ہے۔ اچھے، بُرے، چھوٹے بڑے ایسے کئی شعرا کی فہرست ہے جنہیں ہمارے نقادانِ ذی وقار نے عظمتوں کے تاج سے سرفراز کیا، انہیں بلند و بالا مسندوں پر بٹھایا، بڑی محنت و مشقت کے بعد ہزاروں ہزار محاسن برآمد کے لیکن وہ کسی کی تقدیر نہیں بدل سکے۔ جلد یا بدیر انہیں اپنی اوقات پر آنا ہی پڑا۔ جہاں تک مجاز کا تعلق ہے، اُن کے انتقال کے فوری بعد ان کے فکر وفن یا اُن کی بوقلمون شخصیت پر جو کچھ لکھا گیا اُس میں دوست داری کا جذبہ زیادہ حاوی تھا۔ ہم دردانہ فہم کے ساتھ لکھی ہوئی ان تحریروں اور

یادنگاریوں میں یقیناً ایسا بہت کچھ ہے جسے مجاز شناسی میں خام مواد کے طور پر کام میں لیا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شاعر کی شخصیت کا کوئی عکس ہی اُس کے فکر وفن پر نہیں پڑتا، مجاز، منٹو، میراجی، کیٹس، کافکا، پروست، ایڈگر این یو، بودلیر یا سلویا پھلاتھ وغیرہ کی زندگیوں میں جس ٹیڑھے پن، بے اعتدالی یا خلافِ معمول صورتوں نے اُن کی شخصیت کو ایک پیچیدہ وجود میں بدل دیا تھا وہ از خود بار بار اُکسانے والا تحلیلِ نفسی کا موضوع ہے۔ ان کی زندگیوں کے Facts نے فکشن کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ان میں بعض ایسے بھی ہیں جن کے اسالیبِ فکر پر ان کی پیچیدہ نفسی اور داخلی اجبار کی چھانو بہت کم پڑی جیسے منٹو اور مجاز کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اُن کی محرومیاں اور نفسی فساد اُن کے فنی عمل پر اثر انداز نہیں ہو سکا۔ تخلیقی سطح پر مجاز کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکے لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان کا شعری فن خارجی اور داخلی ساخت کی سطح پر بکھراؤ سے محفوظ رہا۔ ایک ایسا فن کار جسے اپنی زندگی میں تین تین بار جنون کے دورے سے گذرنا پڑا ہو بیخبری جس کی گھٹی میں پڑی ہو اور شعوری کی کارکردگی پر قدغن لگانے کا جسے چسکا پڑ گیا ہو اس کے یہاں لفظ کے برتاؤ میں ضبط کی کیفیت عجیب و غریب الجھن میں ڈال دیتی ہے۔ جنون کے دوروں ہی میں ربط جملے اور مصرعے ان کی زبان سے ادا ہوتے تھے یہ Babbling کی وہ صورت تھی جسے یاوہ گوئی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ مجاز کے سوانح، ان کی عاشق مزاجی، ان کی کم سنی سے بلوغ تک کے غیر معمولی واقعات اور اُن کی نفسی ابنارملٹی کے باوجود حاضر جوابی اور مجلس آرائی کے شوقِ فراواں نے اُن کے اِردگرد ایک ایسا رومانی ہالہ کھینچ دیا تھا جو ان کی شاعری سے زیادہ کشش آور تھا۔ تس پر ان کی موت کا واقعہ جو جتنا الم ناک اور ناگہانی تھا اتنا ہی متوقع بھی تھا۔ مجاز کی شاعری پر لکھنے والا ہر دو چار سطر کے بعد اُن کی شخصیت کے پیچ وخم میں اُلجھ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نسبتاً اُن تحریروں کی تعداد زیادہ ہے جن کا مرکز ومحور مجاز کی زندگی ہے۔ مجاز کے کلام کی قدر شناسی یا محاسبہ کم ہی کیا گیا۔ حتیٰ کہ ترقی پسند ناقدین نے بھی اُن کی شاعری کو اس قدر بھی

لایق اعتنا نہیں سمجھا جتنا دوسرے کم زور ترقی پسند شعرا کو کچھ زیادہ ہی ہمدردانہ فہم کے ساتھ موضوع گفتگو بنایا گیا۔

کہنے کا مقصود یہ کہ وہ رواداریاں جو زندہ اور معاصر شعرا کے درمیان باہم دگری یا باہمی لین دین کا ثبوت فراہم کرتی ہیں مجاز کی بے وقت موت ان کے آڑے آ گئی اور انہیں جلد ہی یادداشت کدوں سے جھٹک دیا گیا۔ منظر سلیم یا محمد حسن کافی عرصے تک اپنے ذہن میں مجاز کی یادوں کی پرورش کرتے رہے۔ ان یادوں میں بڑی کسک تھی اور جو حیرتوں کو اُکسانے سے زیادہ خلش افزا تھیں نیز جو محمد حسن کے ناول 'غمِ دل' 'وحشتِ دل' کے لیے تحریک کا باعث بھی بنیں۔ مجاز کی شخصیت فہمی کے سلسلے میں اس قسم کی تحریروں میں بھی دلچسپی کا کافی سامان موجود ہے۔ پھر بھی یہ تحریریں بڑی حد تک تجسس خیزی سے عاری ہیں۔ باطن کی گرہ کشائی میں محض نفسیاتی بصیرت سے کام نہیں چلتا۔ نفسیاتی علم بھی اتنا ہی ناگزیر ہوتا ہے۔ تحلیل نفسی میں شخصیت کی پیچیدہ گرہوں، نفسیاتی ارتقا کی نوعیت، شعور کے امتناعی عمل، معاشرتی امتناعات وتحریمات، شناختی بحران، سماجی اور اخلاقی مسائل جو بالعموم مذہبی اقدار کے تابع ہوتے ہیں اور جو شخصیت کی آزاد نشو ونما میں رکاوٹ ہی نہیں بنتے شخصیت میں نفاق کے موجب بھی بنتے ہیں۔ جنسی ناآسودگیوں، عدم تکمیل دبی کچلی خواہشوں اور احساس برتری وکم تری سے پیدا ہونے والے غیر متوقع اعمال، نیوراتیت، نرگیست وغیرہ کے تجزیے کی خاص اہمیت ہے۔ کبھی کبھی شخصیت فہمی ہی نہیں شعر کی پیچیدہ گرہوں کو سلجھانے میں بھی ان سے مدد ملتی ہے۔ لیکن شعر فہمی کے ضمن میں کسی بھی علم کے اطلاق کے اپنے کچھ حدود اور کچھ تقاضے ہیں جن کا احساس ضروری ہے۔ مجاز کے سوانح کی اتنی اہمیت نہیں ہے۔ اہمیت ہے ان نفسیاتی مسائل کی جن سے وہ دوچار تھے اور جن کے اسباب کچھ مبہم ہیں کچھ داخلی اور کچھ اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں جس کے اجبار Compulsion کے بہت سے نام ہیں۔

ترقی پسند تحریک کے علمبرداروں نے مجاز کو اس وقت ایک Status symbol بنا کر ضرور پیش کیا جب کہ ان کے کھاتے میں ایسا کوئی نام نہیں تھا جسے مقبولِ ہر خاص و عام کا درجہ حاصل ہو۔ پریم چند اور جوش بہت پہلے کی پیداوار تھے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ تحریک کے تئیں ان بزرگوں کا رویّہ بے حد ہمدردانہ اور مخلصانہ تھا، باوجود اس کے یہ بزرگ اپنا کھیل دکھا چکے تھے۔ دوسری باری کی گنجائش کم ہی تھی۔ سو تمام تر انحصار نوجوان العمر نسل پر تھا۔ مجاز نوجوان تھے اور اُن میں اپنی تمام تر مدہوشیوں کے باوجود بلا کا نوجوانانہ خروش تھا۔ تخلیقیت کے لحاظ سے فیض، سردار جعفری یا جذبی اُن سے بہت پیچھے تھے۔ مجاز نے کم سے کم وقتوں میں زیادہ شہرت پائی۔ اپنی شخصیت کے جداگانہ پن اور شاعری کی بعض Loud خصوصیات کے باعث وہ اس شہرت کے مستحق بھی تھے۔ اس شہرت میں دوسری بہت سی چیزوں کے علاوہ علی گڑھ کا بھی بڑا ہاتھ تھا جو اُس وقت اردو ادیبوں کا گھر آنگن بنا ہوا تھا۔ مجاز کی طرح یہ نوجوان بھی اُس رومانیت کے اسیر تھے جو اُس پورے عہد کی ایک پہچان بن گئی تھی۔ اختر شیرانی ہی نہیں مجنوں، نیاز، یلدرم، قاضی عبدالغفار، مہدی افادی، ناصر دہلوی، خلیقی دہلوی، ل۔ احمد وغیرہ کے ذہنی رویّوں میں رسوم شکنی کا درجہ خاص تھا۔ رومانیت کا ایک تصوّر رسوم شکنی سے بھی وابستہ ہے۔ مرد اساس معاشرے کے تلے دبی کچلی ہوئی عورت کی بے بسی کے خلاف یہ پہلی احتجاج آگیں آوازیں تھیں۔ ان جذبوں میں اخلاص سے زیادہ فیشن شامل تھا اور حصولِ لذّت کے وہ پہلو بھی جو اُن کے جنسی احساسات کے مظہر تھے۔

مجاز کی سراپائی تفصیلات کے پیچھے ان کی حسن پرستی کے جذبات ہی بکار نہیں ہیں بلکہ عورت کی باڈی لینگویج اور اس کے جسمانی خدوخال اور اُبھاروں کو وہ جن متشدّد لفظیات میں ادا کرتے ہیں اُسے شاعر کی جنسی ناآسودگیوں کی ایک ارتقائی شکل کا نام دیا جاسکتا ہے۔ مجاز ایسے لمحوں میں مشابہتوں کی کہکشاں سی خلق کر دیتے ہیں۔ شبیہہ سازی کے

فن میں جوش نے جو مہارتیں دکھائی ہیں اس کے اثر سے مجاز بھی نہیں بچ سکے ہیں۔ جوش عموماً اپنے متشدد جذبوں کی ادائیگی میں حدِ اعتدال سے پرے نکل جاتے ہیں۔ اور شبیہہ سازی محض لفاظی کا نمونہ بن کر رہ جاتی ہے۔ مجاز نے جوش کی صرف کامیابیوں سے نہیں ناکامیوں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ جہاں وہ تشویش اثر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئے ہیں وہاں ان کے بولوں میں حواسی تجربے نے جگہ بنالی ہے۔ اس کے برعکس جہاں وہ جذبوں کے تشدد کے دفاع میں کمزور پڑے وہیں ان کی آواز کا سُر بہت اونچا ہو گیا ہے اور لفظوں سے تخلیقی آب اُڑ گئی ہے۔ 'بتانِ حرم' مجاز کی ایک معروف نظم ہے۔ اس میں بھی دونوں طرح کی مثالیں موجود ہیں:

کیا کہوں میں رات کس محفل میں تھا گرمِ نوا
نغمہ و نکہت کا وہ طوفان، وہ ٹھنڈی ہوا
دیدنی تھا نازنینانِ تمدّن کا ہجوم
بے حقیقت تھے نگاہوں میں مہ و مہر و نجوم
ناز پروردہ حسیں، افکار و غم سے بے نیاز
مہ جبینانِ حرم، قیدِ حرم سے بے نیاز
جن کی اک جنبش سے بنیادِ حرم میں ارتعاش
جن کی اک ٹھوکر سے زنجیرِ قدامت پاش پاش

نظم، جس دھیمے آہنگ میں آہستہ روی کے ساتھ شروع ہوئی تھی یک لخت چوتھے شعر پر آ کر Decadence کی شکار ہو جاتی ہے۔ نازنینانِ تمدّن یا مہ جبیانِ حرم نہ ہوئیں ہنٹر والیاں ہو گئیں۔ وہ ناز پروردہ حسینان جن کے جسم نازک کی لچک خود ان پر ایک بوجھ ہے۔ جن کے سبک چاندی سے پیکر ہیں۔ اُن کی ایک جنبش سے بنیادِ حرم میں زلزلہ واقع ہو جاتا ہے اور جن کی ایک ٹھوکر سے قدامت کی زنجیر پاش پاش ہو جاتی ہے۔ یقیناً یہ ساری

گفتار استعاراتی ہے لیکن استعارے کی نامانوسیت سے اس قسم کی تلفیظ کو عاری ہی کہا جا سکتا ہے۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ اس قسم کی سخن سازی کے لمحوں میں ایک دم جوش کا تشدد آمیز بڑبولا پن حاوی ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس یہ اشعار دیکھیں جس میں ایک متشدد معاشرے کی پالا بندیوں کے ردِ عمل میں جنسی اظہار کیا صورت اختیار کر لیتا ہے:

رُخ پہ شادابی، لبوں میں رس، تبسّم برق پاش
چست پیراہن، نمایاں جسم سیمیں کی تراش

--

آہ وہ دوشیزہ لب، گلریز لب، گلنار لب
آہ وہ لب آشنا لب، شوخ لب، خوں بار لب

--

وہ لچک سی جسمِ نازک میں خود اپنے بار سے
پھوٹ نکلی تھیں شعاعیں عارض و رخسار سے

یہاں رخ کی شادابی، لبوں کے رس، پیراہن کی چستی یا چاندی سے جسم کی تراش مجاز کی لمیاتی محرمیوں ہی کے مظہر ہیں۔ اس اظہار میں نشاط آوری کی کیفیت کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بعد ازاں دوشیزہ لب، گلریز لب اور گلنار لب کے ساتھ آہ کا سابقہ جنسی نارسائیوں کا علامیہ ہے۔ کیوں کہ یہ ہونٹ وہ ہیں جن کا رس کسی اور کے ہونٹوں کا مقدر رہا ہے یہ خیال آتے ہی مجاز کے لیے وہ شوخ و سرخ لب، خوں بار لب کا تاثر فراہم کرنے لگتے ہیں۔ نظم 'کس سے محبت ہے' میں مجاز جس عورت سے محبت کے دعویدار ہیں۔ وہ سراپا رنگ و بو ہے، پیکرِ حسنِ لطافت ہے۔ ثریا بخت ہے، زہرہ جبیں ہے، ماہ طلعت ہے۔ جس کی پیشانی پر قندیل رہبانی کا سایہ ہے۔ تاج سلیمانی کی عظمت جس کے قدم چومتی ہے۔ اتنی مقدس اور باعفت ہے کہ شاعر کی تخئیل کے بازو بھی اسے نہیں چھو سکتے۔ ظاہر ہے یہ عورت

ایک ارضی پیکر ہونے کے باوصف کچھ ایسی خوبیاں بھی رکھتی ہے جو اُسے ایک مثالی شاہکار بنا دیتی ہیں۔ ایک ایسی مثال جو کسی ایک عورت کا نصیب نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ ساری خوبیاں کسی ایک عورت میں مجتمع ہو سکتی ہیں تو سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان کے ساتھ ان جلالی صفات کا شاعر کے پاس کیا جواز ہے۔

وہ ایک مضراب ہے اور چھیڑ سکتی ہے رگِ جاں کو
وہ چنگاری ہے لیکن پھونک سکتی ہے گلستاں کو
وہ بجلی ہے جلا سکتی ہے ساری بزمِ امکاں کو
ابھی میرے ہی دل تک ہیں شرر افشانیاں اُس کی

مجاز کا عہد ہندستان ہی نہیں عالمی سطح پر بھی بڑے انتشار کا زمانہ تھا۔ ایک بہتر سماجی تشکیل کے تصور کے ساتھ نوجوانوں کا ایک حلقہ ترقی پسندی کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ ترقی پسندی کا تصور اُن فرسودہ اقدار کے خلاف تھا جن سے انسانیت کئی داخلی اور خارجی مسائل سے دوچار تھی۔ ان میں وہ اخلاقی اقدار بھی تھیں جن کا مرتبہ تہذیبی زندگی میں کافی بلند خیال کیا جاتا ہے۔ اس باغیانہ رویّے کی ایک صورت نوجوان شعرا کی زندگی کے معمولات میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ان میں وہ فن کار بھی تھے جو غیر ترقی پسند تھے جیسے میراجی اور منٹو یا جن کا تعلق ترقی پسند تحریک کے پیش رو زمانے سے تھا جیسے اختر شیرانی ترقی پسندوں میں اس قماش کی نمائندگی مجاز کر رہے تھے۔ ان ادیبوں میں اپنے عہد کی اخلاقیات اور سیاسی نظام کے خلاف کہیں واضح اور کہیں کسی قدر دبا چھپا غم و غصہ تھا۔ یہ سب اپنے باغیانہ اور غیر رسمی رویّوں کی وجہ سے باغی تھے اور رومانی اسا سا باغی ہی ہوتا ہے۔

مجاز کی برافروختگی کو مجاز کے معاصر دو مغربی میلانات جیسے بیٹ جنریشن اور اینگری ینگ مین سے بھی جوڑ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ میلانات عالمگیر سطح پر جو نوانوں کے اندر پنپتے ہوئے Disillusionment اور ارادوں کی شکست سے پیدا ہونے والی اس

مایوسی کے مظہر تھے جس نے داخلی زندگی کے نظم کو درہم برہم کر دیا تھا۔ مجاز کی طرح نوجوانوں کی یہ نسل اپنے عہد کی مصنوعی تہذیبی زندگی کے اجبار و مظاہر سے شاکی و نالاں تھی۔ جس کے خیالات مقتدرہ establishment کے سیاسی اور سماجی مسلّمات اور زیادتیوں کے سخت خلاف ہی نہ تھے بلکہ اس بورژواژی اخلاقیات سے بھی مزاحم تھے جس کی پاس داری کے لیے باخبری اور ہوش مندی پہلی شرط ہے۔ اس معنی میں میرے نزدیک مجاز بھی اینگری ینگ مین ہی تھے۔

مجاز کی نظموں میں سے ایسے کئی مقامات آتے ہیں جہاں اُن کے پائے استقامت میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے اور اُن کی گرم نفسی اور اندرونی اشتعال کو لفظوں کی ڈھال مل جاتی ہے۔ یہ غصہ وری ایک ایسے نوجوان شاعر کی غصہ وری ہے جو باہر کے جبر کے خلاف نبرد آزما ہونے کی طاقت سے محروم ہے۔ اسی لیے وہ اپنے آپ ہی کو تختۂ مشق بنا کر فنا کی راہ لیتا ہے۔ مجاز نے جہاں لفظوں کی پناہ گاہیں تلاش کی ہیں۔ اُن میں سے چند مثالیں اس نوعیت کی ہیں:

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اِس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
لے کے اِک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں

اس کا گلشن پھونک دوں، اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا، میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

طبیعت کا یہ اچاٹ پن، اکتاہٹ کی یہ کیفیت، یہ جھنجھلاہٹ، یہ توڑ پھوڑ، یہ خالی خولی لفاظی جس میں استعارے سے بھی کام لیا گیا ہے، بہت زیادہ سنجیدہ ذہنوں کو مطمئن کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اس طرح کی چیخ پکار دوسرے کو مشتعل تو کر سکتی ہے لیکن اس قسم کا اشتعال صرف اور صرف سر بازی یا adventure کی راہ دکھا سکتا ہے اس سے کسی خاطر خواہ نتیجے کی امید نہیں کی جا سکتی۔

'نذرِ علی گڑھ' جیسی نظم بھی اس طرح کی شدید گفتار سے نہیں بچ پائی ہے۔ یوں تو نظم میں غلو اور تعلّی کم نہیں ہے تاہم چکاچوند کرنے والے اور سینوں کو گرمانے والے شعری پیکروں کی ایک دنیا اس میں آباد ہے، نیز اُن جذبوں کو برانگیخت کرنے اور تازہ دم رکھنے کی قوت سے بھی یہ سرشار ہے جن کا تعلق علی گڑھ جیسی مادرِ علمی درس گاہ سے ہے۔ میرا اشارہ جن اشعار کی طرف تھا۔ اُن میں سے کچھ یہ ہیں:

اِس فرش سے ہم نے اڑ اڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی، پروین سے رشتے جوڑے ہیں
اس بزم میں تیغیں کھنچی ہیں، اس بزم میں ساغر توڑے ہیں
اِس بزم میں آنکھ بچھائی ہے، اس بزم میں دل تک جوڑے ہیں
اس بزم میں نیزے پھینکے ہیں، اس بزم میں خنجر چومے ہیں
اِس بزم میں گر کر تڑپے ہیں، اِس بزم میں پی کر جھومے ہیں

شاعری کی کلاسیکی روایت کے وقار کو جن ترقی پسند شعرا نے برقرار رکھا اُن میں مجاز کا نام سرفہرست اِن معنوں میں ہونا چاہیے کہ ان کی شاعری ترقی پسند شاعری کا پہلا

تجربہ تھی۔ اپنی بہت سی کمیوں اور کم زوریوں کے باوجود مجاز نے نعرے بازی بہت کم کی اور استدلالی وضاحتوں کی رخنہ اندازی کو مواقع فراہم کرنے کے بجائے کسی نہ کسی حد تک بے تحاشہ تخلیقی وفور کو بھی قابو میں رکھنے اور فقرہ جاتی اور مصرعہ جاتی سطح پر بستہ و پیوستہ لفظی پیرایوں کو ترجیح دینے کی کوشش بھی وہ ضرور کرتے رہے۔ مجاز کی اس تخلیقی استعداد کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ بعض اعتبار سے اختر الایمان اور بعض اعتبار سے فیض سردار اور راہی معصوم رضا نے بھی ان سے کچھ نہ کچھ اخذ کیا ہے یا یہ کہیے کہ انہوں نے چنگاری کو شعلے میں بدل دیا ہے۔

آوارہ ۱۹۳۷ کی نظم ہے یعنی ابھی ترقی پسندی کا تصور بھی بہت صاف نہ تھا۔ حلقہ اربابِ ذوق کی بنیادیں نہیں پڑی تھیں۔ نوجوانوں کی یہ نسل بڑی کشمکش میں تھی بلکہ یہ ایک ناراض نسل تھی جو تخلیقات سے شرابور بھی تھی اور اپنی تخلیقیت کو کوئی سمت بھی دینا چاہتی تھی۔ ترقی پسندی نے ان نوجوانوں کو ایک واضح سمت مہیا کی۔ اقبال نے فکر کو فکرِ محسوس میں بدلنے کا ایک قرینہ پہلے ہی فراہم کر دیا تھا۔ جوش کی غصہ وری بھی اس نسل کے لیے ایک نیا تجربہ تھی۔ اقبال کے مقابلے میں جوش کی پیروی مشکل نہ تھی۔ اختر شیرانی کا طرزِ عشق بھی کم زود اثر نہ تھا۔ مجاز کی آواز اسی پس منظر میں پلی بڑھی تھی۔ اپنی تمام تر بے خبریوں کے باوجود لفظوں کے استعمال کے طریقوں میں مجاز پورے ایک باخبر شاعر کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ''آوارہ'' اس طور کی ایک گراں قدر مثال ہے۔ یہ ایک ایسے نوجوان کا بیانیہ ہے جو دوسروں ہی سے نہیں خود سے بھی ناراض ہے۔ ناراضگی کبھی کبھی بہت اچھی شاعری کا سرچشمہ بن جاتی ہے مجاز نے بند بہ بند منظر نامے کی تبدیلی میں فلمی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ اختر الایمان نے بھی اس تکنیک کو بڑی چابک دستی کے ساتھ برتا ہے۔ مجاز کی نظم ان کے معاصر نسل کی بپتا ہونے کے باوجود مجاز کی اپنی اندرونی آواز ہے جسے ذات کے تجربے سے بھی موسوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کی بیش تر تشبیہیں اور استعارے جیسے تجربے کی کوکھ سے جنمے

ہیں جو آج بھی تازہ دم ہیں اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۳۷ کے دورانیے پر غور کیجیے تو پتہ چلے گا کہ یہ آواز اوروں سے کتنی مختلف تازہ کار اور شعریت سے مالا مال ہے۔ یہی وہ شاعری ہے جس نے امکانات کی بہت سی راہیں وا کی تھیں۔ ایک سمت وہ تھی جسے ترقی پسندی نے مہیا کیا تھا۔ اور دوسری مجاز نے:

وہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پہ تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصوّر جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے دل کا حال
اے غم دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں
پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سے سینے میں اُٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

--

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے مُلّا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

مجاز اپنی زندگی ہی میں خود کو ایک اچھے اور مختلف شاعر کی حیثیت سے منوا چکے تھے اور اُن کی رومانیت بھی کئی معنی میں اختر شیرانی سے اگلا قدم تھی لیکن ابھی اُن کے جوہر پوری طرح کھلے نہیں تھے۔ ایک عمر کے گوناگوں تجربات تو مہیا تھے، اُن کی شیرازہ بندی کی نوبت باقی تھی۔ انفرادیت کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے لیکن ابھی کچھ اور جلا کاری کی ضرورت

تھی۔ ابھی کچھ اور دُکھ جھیلنا اور بھوگنا باقی تھا۔ اثاثہ شعر کو ابھی کچھ اور ثروت مند ہونا تھا۔ آواز نے ابھی تھوڑا بہت استحکام پایا ہی تھا کہ ان کے رخصت کے لمحے نے یک لخت قدغن لگادی۔ بقول احتشام حسین:

> مجاز نے اس کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ شاعری میں تازگی، گرمی اور اثر محض تجربوں سے نہیں خلوص، مقصد کی عظمت، الفاظ کے فن کارانہ صَرف اور فنی روایات کے تخلیقی استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے مجاز کی شاعری چاہے عظیم نہ ہو۔ پُر اثر، پُر سحر اور پُر کار ضرور ہے یہی چیز انہیں اردو کا مقبول اور نوجوانوں کا محبوب شاعر بناتی ہے۔''

کمال احمد صدیقی

مجاز

میری شاعری کا آغاز، ایک حادثہ کا مرہونِ منت ہے، ۱۹۳۵ء میں جس سے دوچار ہوا۔ اس وقت میری عمر نو برس سے چند مہینے زیادہ تھی۔ اس وقت نثر اور نظم کا فرق بھی اچھی طرح نہیں سمجھتا تھا۔ گراموفون ہمارے گھر میں بھی تھا، اس کی وجہ سے گانے سننے کا شوق تھا۔ امیر الدولہ اسلامیہ ہائی اسکول میں، چھٹی جماعت میں داخلہ ہوا تھا۔ اردو کے استاد، قاسم علی صاحب ہفتے میں ایک دن پڑھانے کے بجائے درجے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور بیت بازی ہوتی تھی۔ مہینہ ڈیڑھ مہینے بعد بیت بازی سمجھ میں آنے لگی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ صرف ایک شعر یاد تھا۔ حافظہ میں تھا۔ ریکارڈ سنتے سنتے یاد ہو گیا تھا۔ شاید امراؤ ضیا بیگم کا ریکارڈ تھا۔

طبیعت خوش ہوئی اے ہم نشیں کل جوشؔ سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

شعر کے معنی سمجھ میں نہیں آتے تھے، کیونکہ یہ لفظ صرف اماں، بی بی، منّا اور نانی

اماں کی زبان سے سنا تھا، اور وہ ماما سے کہتی تھیں۔ بوا دیکھتی نہیں، ہانڈی میں کب سے جوش آ رہا ہے۔ اس وقت یہ کہتی تھیں، جب پتیلی میں کچھ اُبلنے لگتا تھا۔ اور پھین پتیلی کے باہر گرنے لگتا تھا۔ شعر میں یہ اُبال کیسے آتا تھا۔ بہر حال گانا گاتا تھا۔ اُبال اور جوش کچھ ہوگا۔ بیت بازی میں ایک دن یہ شعر پڑھنے کا موقعہ مل گیا۔ اس زمانے میں میڈن Maiden کے معنی بھی نہیں معلوم تھے۔ یہ میری Maiden Performance تھی۔ ہوا یہ کہ دوسری پارٹی کی طرف سے ایک شعر پڑھا گیا:

رٹ لگی رہتی ہے یہ ہر دم مجھے
نامہ بر دے جاے خط، لے جاے خط

اس کا جواب بن نہیں پڑ رہا تھا۔ ہار قریب تھی:

طاقچے پر رکھ دو یہ بے کار خط
پہلے بھی آئے تھے کچھ دو چار خط

زندگی میں پہلی بار یہ تک بندی کی تھی۔ حیرت ہوئی اس کو قبول کر لیا گیا اور فریق مخالف کو ط سے شروع ہونے والا شعر یاد نہیں تھا۔ جیت ہمارے دھڑے کی ہوگئی۔

کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی۔ کہانی یہاں سے شروع ہوئی۔

میرے برابر کی ڈیسک میرے ایک ہم جماعت کی تھی۔ نام یاد نہیں۔ یادداشت ساتھ نہیں دیتی۔ اسے بتا دیا تھا کہ یہ تک بندی میری تھی۔ اس سے کسی بات پر ان بن ہوگئی تو، قاسم علی صاحب سے شکایت جڑ دی: کمال نے جو شعر پڑھا تھا، وہ غلط تھا۔ وہ شعر کسی کتاب میں نہیں ہے۔ خود کمال نے گڑھا تھا۔ قاسم صاحب سے شکایت، کلاس شروع ہونے سے پہلے کی گئی تھی۔ انہوں نے چاک میز پر رکھ دی اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ مجھ سے پوچھا: کیا یہ بات درست ہے؟ میں نے بڑے خوف کے عالم میں، شرمندگی اور گھبراہٹ سے کہا: جی ہاں۔ قاسم علی صاحب نے کہا: اِدھر آیئے۔ میں ڈرتا ڈرتا گیا۔ کلاس تماشہ دیکھنے

کا منتظر تھا۔ میں ان کی کرسی کے قریب گیا، تو وہ اُٹھے، اور تادیبی کارروائی کے بجائے انہوں نے میری گردن کے نیچے پشت پر اپنا ہاتھ رکھا، اور شاباشی دی۔ فرمایا: زبان پڑھانے کا مقصد یہ ہے کہ اگر ادبی صلاحیت طالب علم میں ہے، تو اس کو ابھارا جائے۔ جن میں صلاحیت نہیں ہے، ان میں اگر صلاحیت نہ پیدا کی جاسکے تو کم از کم ذوق ادب کی پیدا کیا جائے۔ تم میں صلاحیت ہے۔ تم مشق کرو۔ عید کے بعد اسکول کا مشاعرہ ہوگا۔ طرح ہے: بہارِ عید ہے، پھر وادیِ میخانہ ہو جائے۔ اس پر شعر لکھو۔ میں گھبرا گیا۔ وہ بھی سمجھ گئے۔ چاک سے لے کر اُٹھے۔ بلیک بورڈ پر گئے، ایک شعر لکھا۔ ردیف کیا ہے، قافیہ کیا ہے، مطلع کیا ہے، مقطع کیا ہے، شعر کیا ہے، یہ باتیں بتائیں۔ میں نے سوچا کہ یہ تو مصیبت ہوگئی۔

چھٹی کے بعد گھر گیا۔ شام کو ابا گھر آئے، تو اُن سے روئداد، بلکہ بپتا بتائی، تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے کہا: محمود، سیّد، بشیر، افتخار، سب شاعر ہیں۔ تمہارے دادا بھی شاعر تھے، زاہدؔ تخلص کرتے تھے۔ مگر وہ فارسی میں کہتے تھے۔ گھر میں مشاعروں کے گلدستے تھے، اور سبھی میں سنجھلے ابا (سید احمد عالی) کی غزلیں (طرح میں) تھیں۔ تربیت چچا جان (بشیر) کے سپرد کردی گئی۔ دو برس بعد جب فارسی کا مضمون لیا، تو گردانیں یاد کر لینے کے بعد محقق طوسی کی کتاب معیار الاشعار سبقاً سبقاً پڑھائی، ابا نے۔

امیر الدولہ اسلامیہ ہائی اسکول کے مشاعرے کے لیے غزل کہی۔ چچا جان نے اصلاحی نظر ڈالی۔ شراب کے نشے کے سلسلے میں ایک روایتی مضمون بھی باندھا تھا، کیونکہ غزل میں ردیف/قافیہ مضمون سمجھاتے ہیں، نومشقوں ہی کو نہیں، اساتذہ کو بھی۔ قافیہ پیمانہ، مے خانہ ہوں، تو شراب لازماً ہوگی۔ میں نے تیز مے رکھا تھا۔ چچا جان نے تیز کو تُند بنا دیا۔ حیرت ہوئی کہ مشاعرہ میں طلبہ کی کاوشوں میں اسے سب سے زیادہ نمبر ملے، اور اس غزل کو گولڈ میڈل دیا گیا، اور ساتھ میں میر کا کلیات، غالب، مومن، امیر مینائی اور داغ کے دیوان۔ اور اردو محاوروں کی ایک کتاب ان کتابوں کو اتنا پڑھا کہ ازبر ہوگئیں۔ گلے میں

سُر یلا پن پیدائشی صلاحیت ہے۔ اس سے میں محروم ہوں۔ لیکن سماعت، سروں میں تمیز کرنے کی صلاحیت سے معذور نہیں ہے۔ اسے میں قدرت کی ایک بہت قیمتی دین سمجھتا ہوں۔ گراموں فون ریکارڈ سننے سے اس سمعی صلاحیت کی غیر محسوس طریقے سے تربیت ہوئی۔ اس صلاحیت کی وجہ سے مختلف آہنگوں کی فوری شناخت کا ملکہ اوائل عمر میں پیدا ہوگیا، اور اس کی وجہ سے عروض کے نکات، جو معیار الاشعار سے سبقاً سبقاً ابا نے پڑھاے، پوری طرح ذہن نشین ہوگئے، اور بہت کچی عمر میں غیر مروّج آہنگوں میں بھی کلام موزوں کی مشق کرنے لگا۔

یادداشت بہت اچھی تھی۔ ڈیڑھ دو برس کی عمر کے کچھ واقعات اب بھی یاد ہیں۔ لیکن یہ یادداشت عجیب گورکھ دھندا ہے۔ بیسویں صدی کے آخری دہے سے پہلے تک جو یادداشت کسی قدر رشک سے احباب اور شریکِ کار Caro Index Memory کہتے تھے، اور کسی معاملے میں پرانے احکامات کے لیے، چاہے اُن کا تعلق میرے شعبے سے نہ ہو، مجھ سے رجوع کرتے تھے، اب وہی شعر، یا لفظ یا نام ذہن سے اُتر جاتا ہے، جس کی اس وقت ضرورت ہوتی ہے۔ کسی اور کے تو کیا، اپنے گھر کے سب فون نمبر یاد نہیں۔ احباب، بیٹوں، بیٹیوں کے فون نمبر یاد نہیں۔ پہلے طویل آزاد نظمیں یاد تھیں۔ اب کسی کی یا اپنی ایک بھی پوری غزل یاد نہیں۔ ۱۹۸۴ میں گردن میں ایک گلٹی نکل آئی۔ سال بھر دواوں کا جب کوئی اثر نہیں ہوا، تو آپریشن ہوا۔ چار پانچ گھنٹے کی بے ہوشی کی بعد، ہوش آیا، تو یادداشت میں کچھ رخنے محسوس ہوے۔ ۱۹۹۱ سے ۱۹۹۴ تک کینسر کے چار آپریشن ہوے، اور مکمل بے ہوشی کے تحت تو یادداشت میں افراتفری کا سلسلہ زیادہ بڑھا اور پھر جب اکیسویں صدی کے پہلے برس میں دل کی چاروں نالیاں بدلی گئیں اور دن میں گیارہ بجے سے اگلی صبح چار بجے تک بے ہوش رہنے کے بعد ہوش آنا شروع ہوا، یادداشت ماؤف تھی۔ واپس آئی لیکن ادھوری، بڑی عجیب سی بات ہے۔ عہد طفلی کی، دو سے چار برس تک کی بہت سی باتیں یاد ہیں۔ لیکن بعد کی باتیں یاد نہیں۔ لیکن مجاز کے سلسلے میں۔ اُن سے متعلق ہر بات یاد ہے۔

پہلی بار انہیں امیر الدولہ اسلامیہ ہائی اسکول کے مشاعرے میں دیکھا اور سنا تھا۔ اور شاعر بھی تھے۔ یاد، مجاز کے علاوہ صرف روش صدیقی ہیں۔ مجاز نے نظم آوارہ سنائی تھی۔ پھر نرس کی چارہ گری کی فرماش ہوئی۔ وہ بھی انہوں نے سنائی، لیکن اس جملے کے ساتھ: وہ بی آوارہ تھی۔ مجاز کو میں نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ....گالی کا مستحق وہ صرف اہلِ محنت کی محنت کا استحصال کرنے والوں کو، اور منافقوں کو اور بدکرداروں کو سمجھتے تھے۔ چاہے وہ اُجلے کپڑے ہی کیوں نہ پہنتے ہوں۔ زندگی کے بارے میں اُن کا نظریہ اُن کے اس مقولے سے واضح ہے:

''شراب چاہے خراب ہو، کمپنی ضرور اچھی ہو''

برجستہ جملہ چُست کرنے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس فن میں ایسا ذہین اور درّاک میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔ تحریر میں یہ شگفتگی رشید احمد صدیقی، شفیق الرحمٰن اور مشتاق یوسفی کے حصّے میں آئی۔

لکھنؤ کی شاعری کا ایک خاص اسلوب بن گیا۔ لکھنؤ اور دلّی کے دبستانوں کے سلسلے میں بڑی تدقیق کی گئی۔ ابواللیث صدیقی صاحب اور استاذی نورالحسن ہاشمی صاحب کی ان دو دبستانوں پر نہایت اہم کتابیں ہیں، لیکن ایک طالب علم کی حیثیت سے، جو میں آج بھی ہوں، میں سراج الدین خان آرزو، انشا، مصحفی، خدائے سخن، میر تقی میر ان کے بزرگ ہم عصر میرزا محمد رفیع سودا کو کیسے نظرانداز کردوں، میر ضاحک اور سحرالبیان کے مصنف میر حسن کو کیسے نظرانداز کردوں، کہ ان کا خانوادہ میر انیس کا خانوادہ ہے۔ غالب کی شاعری کے سرچشمے/سرچشموں کو میرزا عبدالقادر بیدل اور خدائے سخن میر تقی میر تک تلاش کیا جاتا ہے۔ لیکن غالب نے میر کا حوالہ ناسخ کے مصرع میں تحریف کے ساتھ دیا ہے:

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

اور یہ کہتے ہیں، اشارہ کس کی طرف ہے؟ ناسخ کی طرف:

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے، جو معتقدِ میر نہیں

ناسخ کے پہلے دیوان میں دوغزلہ ہے۔ دوسری غزل کا مقطع ہے:

شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ پیر نہیں

سوداا اور ناسخ کی زمینوں میں غالب کی غزلیں ہیں۔ غالب نے ناسخ کا حوالہ دیا ہے، لیکن مصرع میں قافیہ میر رکھا ہے، پیر کے بجائے۔

دلّی کے شعرا کے لکھنؤ (اور فیض آباد) جانے کی وجہ سے، اُن کے اثرات لکھنؤ کی شاعری پر پڑے۔ اور خود انہوں نے بھی لکھنؤ کے اثرات قبول کیے۔

مجاز نے آگرہ اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ دلّی میں آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت بھی کی۔ اگرچہ یہ ان کی زندگی کا کوئی اہم باب نہیں ہوسکتا، بجز اس کے کہ اُن کے ساتھ ایک خاتون کا نام، یا ایک خاتون کے ساتھ اُن کا نام لیا جانے لگا۔ چالیس کے دہے میں جب وہ لکھنؤ میں تھے، تو انہوں نے ایک نظم کہی تھی:

میں نے مانا کہ تم اک پیکرِ رعنائی ہو
بنتِ مہتاب ہو گردوں سے اُتر ہوئی ہو

اور جس مصرع کی تکرار ہے وہ ہے: ''اب مرے پاس تم آئی ہو تو کیا آئی ہو''

اس کے باوجود دلّی کے قیام کو ان کی زندگی یا ان کی شاعری میں کوئی اہم مقام حاصل نہیں ہے۔ ان دنوں میں اُن کے ہم عصر۔ جن کا نام اس عہد کی شاعری میں مخدوم اور فیض کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ معین احسن جذبی بھی دلّی میں تھے۔

دلّی کا ذکر خود مجاز نے ۱۹۴۷ یا آس پاس کی ایک نظم میں کیا ہے، جب وہ کچھ روز کے لیے الہ آباد گئے تھے:

الٰہ آباد میں ہر سُو ہیں چرچے
کہ دلّی کا شرابی آگیا ہے
گلابی لاؤ، چھلکاؤ، لنڈھاؤ
کہ شیدائے گلابی آگیا ہے!

لیکن یہ وہ زمانہ ہے، جب ان کی شاعری میں پہلی سی توانائی نہیں رہی تھی۔ آخری چمک یہ تھی:

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

مجاز کو دوسری بار ۱۹۴۳ کے مشاعرے میں دیکھا، جو دوسری جنگ عظیم میں ہندستانیوں کی شرکت یعنی War efort کے سلسلے میں تھا۔ ملکی پیمانے پر ایک محکمہ پروپگنڈا کے لیے تھا، جس کے ڈائرکٹر حفیظ جالندھری تھے۔ اور لکھنؤ میں پروپگنڈا آفسر تھے شوکت تھانوی۔ شوکت آل انڈیا ریوڈیو میں بچوں کے لیے مزاحیہ فیچر لکھتے اور پیش کرتے تھے۔ ریڈیو سے وہ جنگی پروپگنڈا کے محکمے میں آگئے تھے۔ مجاز دلّی سے بلائے گئے تھے۔ ان کی نظم تھی:

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر
ابھی تو درد ٹپکے گا مری آواز سے آخر
ابھی تو.....

ابھی ہے عشق پر آئین فرسودہ کی پابندی
ابھی تو حسن کے پیروں پہ ہے حبرِ حنا بندی

--

میں جاؤں گا، میں جاؤں گا، میں جاتا ہوں میں جاتا ہوں

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

مجاز کراگل کی تو نہیں، فرکی، جناح کیپ، شیروانی اور پینٹ میں تھے۔ لباس بالکل نیا، کورا تھا۔ پھر اس لباس میں ان کو نہیں دیکھا۔ کرتا پاجامہ علی گڑھ کٹ کا تنگ موری کا اور جوار جیکٹ گرمیوں میں، اور شیروانی جاڑوں میں پہنتے تھے۔

مجاز سے پہلی ملاقات سنہ ۴۴ میں ہوئی۔ وہ ریڈیو کے مشاعرے میں شرکت کرنے دلّی سے آئے تھے۔ مشاعرے کے بعد ایک نشست لکھنؤ یونیورسٹی کے محمود آباد ہاسٹل میں ہوئی۔ مجاز کے علاوہ روش صدیقی، مسعود اختر جمال اور مقامی شاعروں سلام مچھلی شہری کو اور مجھے بلایا گیا تھا۔ طرحی مشاعروں میں میری غزلیں کچھ مختلف ہوتی تھیں، میرے چچاؤں کے رنگِ سخن سے یکسر مختلف، اور پھر ایک مشاعرے میں، جس کی صدارت عبدالباری آسی صاحب کر رہے تھے، ایک ایسی بات ہوئی، جس کا کسی کو گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ مجھے بھی نہیں۔ آسی صاحب کبھی مشاعرے میں اپنا کلام خود نہیں پڑھتے تھے۔ میں سب سے کم عمر شاعر تھا۔ نیا گاوں میں، میرے چچاؤں کے یہاں جو ہفتہ وار نشست ہوتی تھی، یا سالانہ مشاعرہ بڑے پیمانے پر ہوتا تھا، جس میں آرزو صاحب (اگر لکھنؤ میں ہوتے) پرنس ہادی مرزا، آسی صاحب، سراج صاحب، ساغر نظامی (اگر لکھنؤ آئے ہوئے ہوں)، سالک لکھنوی وغیرہ شرکت کرتے تھے۔ میں ان میں ابتدا میں پڑھتا۔ لیکن شہر میں کہیں اور مشاعرہ ہوتو درمیان میں نام پکارا جاتا۔ اس کے لیے آسی صاحب نے ہدایت دے رکھی تھی۔ اس کی وجہ شاید ایک یہ بھی تھی کہ رباعیاں صرف یگانہ چنگیزی کہتے تھے۔ لیکن وہ مشاعروں میں نہیں آتے تھے۔ یا پھر آسی صاحب کہتے تھے۔ ایک آدھ رباعی سراج صاحب نے بھی کہی تھی۔ لیکن رباعی کا رواج نہیں تھا۔ جوش ملیح آبادی کا مجموعہ جنون وحکمت پڑھنے کے بعد میں رباعیاں کہنے پر جُٹ گیا، یہ بات آسی

صاحب کو اچھی نہیں لگی، انہوں نے شکایتاً ابا سے بھی اور چچاؤں سے بھی کہا کہ یہ عشق کی مہ بے کمال سے کہیے کہ غزل پر ہی توجہ دیں۔ سب نے اُن سے اتفاق کیا، لیکن کہا کہ رباعیاں کہنے دیجیے۔ راہِ راست پر آجائے گا۔

اب اس مشاعرے کی بات طرح کے دو مصرعے دیے تھے:

۱۔ قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

۲۔ بھٹکتے پھر رہے ہیں، رہبرِ کامل نہیں ملتا

آدھی رات کے وقت جب میرا نام آسی صاحب نے پکارا تو میں تخت پر گیا، صدر سے اجازت لی اور رہبرِ کامل نہیں ملتا کی زمین، تین مطلعوں کے ساتھ سات شعروں کی غزل پڑھی۔ جب غزل پڑھ چکا تو آسی صاحب نے پیٹھ تھپتھپائی، اور آواز دی ''بزار! بیاض لاؤ۔ اب اس زمین میں غزل نہیں پڑھی جائے گی۔'' میں تخت سے اُتر کے پہلو میں پہنچا جہاں فرش پر بیٹھا تھا، آ کے بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا۔ آسی صاحب مٹھی بند کر کے انگلیوں میں فاؤنٹن پن دبائے، نامو جود کوئی چیز اچھالتے جاتے ہیں، اور سبز روشنائی والے قلم سے بیاض میں شعر لکھتے جاتے ہیں۔ اِدھر شاعر نے اپنا کلام ختم کیا، آسی صاحب نے آواز دی:

''بزار، بیاض لے جاؤ!''

اگلے روز سے لکھنؤ کے شاعروں کے حلقوں میں چرچے ہونے لگے، جوش بڑھتے رہے۔ یہی وہ زمانہ تھا۔ جب دلّی اور لاہور کے رسالوں میں میری کہانیاں بھی چھپنا شروع ہوئیں۔ کہانیاں صرف ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کی چھپتی تھیں۔ آگرہ کے رسالے شاعر میں بھی کہانیاں چھپیں اور نظمیں بھی۔ لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں متعارف ہو گیا۔

لکھنؤ یونیورسٹی میں اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کا حلقہ۔ حلقۂ احباب سید احتشام حسین صاحب کی سرپرستی میں ضابطے کی انجمن نہیں بلکہ مفکر طلبہ طالبات کا محمد حسن کے سپرد تھا، جن کے مراسم مجاز، فراق، مسعود اختر جمال، سلام مچھلی شہری، نصیر حیدر وغیرہ سے

تھے۔ نصیر حیدر بڑی صلاحیتوں کے شاعر تھے، لیکن انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو بروے کار نہیں آنے دیا۔ ان کا ایک شعر ہے:

کچھ ہوا تیز تھی، کھلی تھی کتاب
ایک پچھلا ورق اُلٹ آیا!

ان کا کچھ کلام نیا دور (بنگلور) کے ایک شمارے میں چھپا تھا۔ ریڈیو میں پروگرام اسسٹنٹ تھے۔ اُس زمانے میں جب پروگرام اسسٹنٹ کو براڈ کاسٹنگ کی ریڑھ کی ہڈی سمجھا جاتا تھا۔ تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے۔ کراچی میں آرٹ کونسل کے سکریٹری بھی رہے۔ مجاز کے قریبی حلقے کے احباب میں سے تھے۔ انہوں نے مجاز کی ہی طرح خود کو ضائع کیا۔ البتہ مجاز نے اردو شاعری کو ایک رجحان، اور اہم رجحان دے کر ضائع کیا۔ ان دونوں میں صرف اتنا سا یا اتنا زیادہ فرق ہے۔

اگرچہ میں بے قافیہ نظمیں اور آزاد نظمیں لکھنے لگا تھا۔ لیکن محمود آباد ہوسٹل کی اُس نشست میں میں، پانچ پانچ مصرعوں کے گیارہ بندوں کی ایک نظم پڑھی۔ ہر بند کے قافیہ گماں، نہاں، عیاں، رواں وغیرہ تھے۔ سب نے بڑی توجہ سے نظم سنی، سب کا کلام اسی توجہ سے سنا گیا تھا۔ مجاز کچھ زیادہ متوجہ ہوے۔ روش صاحب کو شاید یہ بات پسند نہیں آئی، اور انہوں نے ہجو ملیح کی۔ مجاز کو یہ بات پسند نہیں آئی، اور انہوں نے روش صاحب کو اپنے جملوں سے اُلّو کر دیا۔

چاے والے کے بعد محفل برخاست ہوئی تو مجاز نے کہا؟ آپ کے پاس وقت ہو تو میرے ساتھ چلیے۔ میں اُن کے ساتھ ہولیا۔ یونیورسی سے کچھ دور پر ان کے والد کی کوٹھی، نیو حیدر آباد میں تھی۔ قیام گاہ پر جانے سے پہلے وہ بال کٹوانے کے لیے ایک سیلون میں گئے۔ میں ساتھ تھا۔ انہوں نے پوچھا کہ آپ نے کیا کیا پڑھا ہے۔ میں نے کلیات میر، دیوان غالب، مومن، امیر مینائی اور داغ کے دیوانوں کے علاوہ جوش کی رباعیوں جنونِ

حکمت کا ذکر کیا، تو وہ کچھ چونکے۔ پوچھا۔ نظمیں اور بھی پڑھی ہیں۔ میں نے اقبال، چکبست کے علاوہ حسرت موہانی کی غزلوں اور نظموں کا ذکر کیا۔ اور کہا کہ حسرت کی نظمیں مسلسل غزلیں زیادہ ہیں۔ بہت خوش ہوئے۔ پوچھا: میرا کلام بھی پڑھا ہے۔ میں نے کہا کہ پڑھا تو نہیں، سنا ہے۔ دو مشاعروں اور ایک ریڈیو کے مشاعرے میں سنا۔ پوچھا: اچھا تو یہ مشاعرہ بھی سنا۔ کیا خیال ہے۔ میں نے کہا: کچھ لوگ اور بھی سن رہے تھے۔ ایک صاحب نے کہا تھا: ان کو دمہ معلوم ہوتا ہے۔ مجاز نے کہا، اُن سے کہیے گا کہ دمہ نہیں، وہ سور ہے۔ پھر وہ گھر لے گئے۔ چائے پی کر میں نے رخصت چاہی اور چلا آیا۔ مجاز تین چار بار دلّی اور بمبئی گئے اور آئے۔ پھر مستقل طور سے لکھنؤ آ گئے۔ میں روز شام کو حضرت گنج کے کافی ہاؤس جانے والوں میں سے تھا۔ سلام بھی روز جاتے تھے۔ مجاز لکھنؤ آ گئے تو وہ روز آنے لگے۔ ۴۵ میں میں نے لکھنؤ یونیورسٹی میں بی۔ اے میں داخلہ لے لیا، اگرچہ ریجنل مارکٹنگ آفس میں اسسٹنٹ مارکٹنگ انسپکٹر بھی تھا۔ کافی ہاؤس شام کا معمول تھا۔ ڈاکٹر علیم شعبۂ عربی میں استاد تھے۔ انہوں نے اپنی میز پر بٹھانا شروع کر دیا۔ پھر ایک دن انہوں نے کہا: کمال! میں نے بہت دن سے مارکس کو پڑھا نہیں۔ مارکس کا نظریہ زائد المیعاد تو نہیں ہو گیا ہے۔ میں نے کہا: کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میں نے تفصیل سے مارکس کو نہیں پڑھا ہے۔ صرف جوڈ Joad کی کتاب میں میٹیریل فلاسفی کی بنیادی باتیں پڑھی ہیں۔ ہو سکتا ہے مارکس زاید المعیاد ہو گیا ہے۔ پڑھنے کے بعد کچھ عرض کر سکوں گا۔ علیم صاحب نے کہا، ہاں، پڑھیے اور مجھے بتائیے پیپلز بک ہاؤس سے مارکس انگلز کی کتابیں خریدیں۔ گھر آ کر دیکھیں، اُلٹ پلٹ کر پڑھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بہت بھاری پتھر تھا۔ چوم چاٹ کر رکھنے سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ ڈاکٹر رشید جہاں کے پاس گیا۔ بہت شفقت کرتی تھیں۔ اُن سے پوچھنے کو جی نہ چاہا۔ کامریڈ رشید کو لے کر نیچے اُترا، اور اُن سے کہا کہ مارکس کے بارے میں بنیادی باتیں بتائیں۔ انہوں نے کہا: ایک رسالہ ایملی برنس کا ہے۔ پہلے اُسے پڑھ

لیجیے، پھر بات کریں گے۔ اسے پڑھا تو سرپلس ویلیو کی بات سمجھ میں آئی۔ غور کیا، تو بات سمجھ میں آئی کہ انسانی محنت کا استحصال ذاتی مفاد کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔ یہ نکتہ سمجھ میں آ گیا۔ اور مارکس کو سمجھنا آسان ہو گیا۔ کئی مہینوں بعد علیم صاحب نے، کافی ہاؤس سے اُٹھ کر پی ایم جی آفس تک کی معمول کی چہل قدمی میں پوچھا: ''کمال، آپ نے مارکس کو پڑھا، میں نے کہا: جی ہاں۔ اور وہ نہ صرف زائد المیعاد نہیں ہوا ہے، بلکہ کبھی زائد المیعاد نہیں ہوگا۔

یہی نظریہ اسرار الحق مجاز کا بھی تھا، اور اردو شاعری پہلی بار انسان، انسانی محنت اور انسانی اقدار کا یہ تصور ذہن میں رکھنے والے جس شاعر نے نظمیں لکھیں، وہ تھا اسرار الحق مجاز۔ شاعری میں پہلی بار ان اقدار کی بنیاد پر شاعری کرنے والے مجاز نے ہزاروں کیا، سیکڑوں نظمیں بھی نہیں لکھیں، صرف چند نظمیں لکھیں۔ مجاز نئی ڈگر بنانے والا شاعر ہے۔ اور اس اعتبار سے اردو میں اس کی شاعری واقعی عہد آفریں ہے۔ عہد آفریں شاعر، تاریخ کے اہم موڑ پر، کاروانِ فکر کے لیے نیا راستہ تلاش کرتے ہیں، اگر انہیں معلوم ہو کہ ان کی منزل کیا ہے، کہاں ہے۔ مجاز نے بے سمت شاعری سے ابتدا کی تھی، لیکن صحیح سمت کی طرف رُخ تھا۔.....

مجاز اردو میں ترقی پسند شاعری کا پہلا نقیب ہے۔ آج ہم اسی حیثیت سے اس کی یاد تازہ کرنے کو جمع ہوے ہیں۔

مجاز نے شعر کے فنی نکات احسن مارہروی، اور فانی بدایونی سے سیکھے تھے۔ لیکن ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو صحیح سمت کیسے ملی؟ اس سلسلے میں، اپنے عہد کے اردو کے سب سے بڑے دانشور اختر رائے پوری کا کلیدی رول ہے۔

جناب صدر، خواتین، حضرات، ایک بڑی سعادت میرے حصہ میں بھی آئی ہے، یہ ایک ایسا عطیہ ہے، جو بغیر کسی کاوش، محنت یا کوشش کے مجھے ملا ہے۔ آئینۂ حیرت (گوری

اوگوری) کے مصنف سید رفیق حسین میری والدہ کے کزن تھے۔ فکشن کے راستہ پر انہوں نے مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ میرا پہلا مجموعۂ کلام بادبان، اُن کے اور شاہد احمد دہلوی کے نام معنون ہے۔ رفیق ماموں کی سگی بہن علی گڑھ کے نیلی چھتری والے ظفر عمر کو منسوب تھیں، اور انہی کی بیٹی حمیدہ آپا اختر حسین رائے سے منسوب تھیں۔ اختر رائے پوری اور حمیدہ آپا سے ملاقاتیں صرف کراچی اور لندن میں رہیں، لیکن وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ اپنی خود نوشت گردِ راہ انہوں نے تحفتہً مجھے دی تھی۔

اختر رائے پوری انگریزی، ہندی اور مادری زبان اردو پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب وہ کلکتہ گئے تو وہاں انقلابی تحریک زوروں پر تھی۔ وہ وشوامتر میں صحافت سے جڑے، اور منجملہ اور مضامین کے انہوں نے ادب اور سابتیہ لکھا، جس نے نظریاتی اساس پیش کی۔ مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کے رسالے اردو میں اختر رائے پوری کا یہ مضمون چھاپا۔ لیکن نظام کی ریاست میں ادب اور انقلاب کا عنوان ادب اور سماج رکھا۔ بعد میں ناگپور سے کتاب ادب اور انقلاب کے نام سے چھپی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں پڑی۔ کانفرنس کی صدارت منشی پریم چند نے کی۔ اختر رائے پوری کی کتاب اور مضامین اس تحریک کے لیے فضا تیار کر چکے تھے۔ یہاں میں مجاز کی شاعری کی اُٹھان کے سلسلے میں گردِ راہ سے عبارت نقل کروں گا:

> ''جب مجاز نے اپنا تعارف مولانا احسن مارہروی کے شاگرد کی حیثیت سے کرایا، اور دو تین فرسودہ سی غزلیں سنائیں، تو میں نے بلا تکلف اپنی بیزاری کا اظہار کیا۔ میں نے زبان و بیان پر نکتہ چینی کی بے جا کوشش نہیں کی، بلکہ یہ کہا کہ اگر شاعری میں انسانی مسائل کو سمجھنے سمجھانے کا سلیقہ نہیں، تو اسے انسان کو مخاطب کرنے کا حق نہیں۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ لہجہ

نیا تھا۔ مجاز اس تقریر کو سن کر بہت چونکے، اور ان کی حیران آنکھوں میں فکر و فہم کی جو کیفیت ظاہر ہوئی، وہ اب تک مجھے یاد ہے۔ پھر وہ مجھ سے ملنے اکثر آفتاب ہوسٹل آنے لگے۔ میں انہیں اپنے مبلغ علم سے (جو مختصر ہونے کے باوجود، اُن کے لیے قابلِ توجہ تھا) آگاہ کرتا رہتا تھا۔ اس گفت و شنید میں سال بھر کا عرصہ گزر چکا اور اب مجاز نے پرانے انداز کی غزل سرائی ترک کر دی۔ ایک بار دونوں وقت ملے، جب ہم اسٹیشن پہنچے، تو ریل گاڑی کے تیسرے درجے کے ایک ڈبّے کے آگے ٹھٹھک کر رہ گئے۔ اُس میں ایک نوخیز گوجر حسینہ، گلے میں چاندی کا کنٹھا، اور کان میں پیتل کا بالا ڈالے، پھٹے حالوں، اس آن بان سے فروکش تھی کہ تماش بین محوِ حیرت اور خوانچہ والے دم بخود تھے۔ ریل چلتے وقت اُس نے نگاہِ غلط انداز سے ہمیں خدا حافظ کہا، اور ہم اس پر درود سلام بھیجتے ہوئے واپس چل پڑے۔ میں نے کہا: مجاز! اسے کہتے ہیں، گدڑی میں لعل۔ تم اُس پر ایک نظم لکھ ڈالو۔ وہ کہنے لگے، میں نے اب تک نظم نہیں لکھی، لیکن کوشش کروں گا۔ چند ہفتوں بعد انہوں نے مجھے رات اور ریل کا مسوّدہ دکھایا، جو اس نظارے کا مظہر تو نہیں، لیکن اس سے متاثر ضرور تھا۔ صحیح معنوں میں مجاز کی شاعری کا آغاز اس طرح ہوا۔ مجاز نے رات اور ریل سے بہتر نظمیں لکھی، لیکن اُن کے فن کے خدوخال اس میں نمایاں ہو چکے ہیں۔ آہنگ و ترنّم کی وہ کھنک موجود ہے، جس نے اُن کے کلام کو قبولِ عام بخشا۔ گو جوش ملیح آبادی کی صحبت بعد میں انہیں میسر ہوئی، لیکن ان کی

نظم جنگل کی شہزادی کا اثر رات اور ریل پر عیاں ہے۔ بعد میں ذاتی قربت کے باوجود مجاز کی شخصیت اور شاعری پر جوش کا ویسا گہرا اثر نہیں تھا، جیسا کہ باور کیا جاتا ہے۔..... مجاز کا ملنا جلنا اختر شیرانی سے زیادہ تو نہ تھا۔ لیکن جو لوگ میری طرح ان دونوں کو جانتے تھے، وہ شہادت دیں گے کہ فقط لفاظی کی شاعری نہیں، بلکہ شخصیت میں بھی حیرت ناک مماثلت تھی۔ ہم عصر شاعروں کی برادری میں ان دونوں سے زیادہ معصوم و محروم دیکھنے میں نہ آئے۔ دونوں کسی اصلی یا خیالی معشوق کی تلاش میں جام بکف سرگرداں رہے۔ اور جب جوانی کا نشہ اُترا، تو جامِ سفال ان کے ہاتھوں سے گر کر چور چور ہو گیا۔ البتہ اس جامِ شکستہ کی صدائے بازگشت اردو شاعری میں دیر تک گونجتی رہے گی۔'' (ص ۴۷)

''رات اور ریل'' کا ذکر، سجاد ظہیر نے بھی آہنگ کے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں کیا تھا۔ مجاز پر اب تک دو بنیادی کام ہوے ہیں۔ مجاز پر ایک کتاب، جو منظر سلیم کا ایم اے کا ڈسرٹیشن تھا۔ دوسری محمد حسن کی کتاب، جو مجاز کی سوانح، افسانوی سوانح نہیں تخلیقی سوانح کہی جا سکتی ہے۔ محمد حسن سے زیادہ شاید کسی اور دانشور نے مجاز کو نہیں سمجھا۔ پچا سکنے کی حد سے زیادہ شراب پی کر، سماجی ذمہ داریوں کا لبادہ اتار پھینکے اور سڑکوں پر، نالیوں میں پڑا رہنے کو بوہمین پن کی معراج سمجھنا درست نہیں۔ غالب نے کہا تھا:

پیانہ برآں رند خرام است، کہ غالب
در بے خودی اندازۂ گفتار نہ دارد

مجاز بڑی آن بان والے تھے۔ ان کی انا، مہذب انسان کی انا تھی۔ ہوا بھرا ہوا غبارہ نہ تھی۔ ہوش میں بھی، ہوش سے بیخودی کے مرحلوں میں اور بے خودی کے عالم میں بھی

میں نے ان کو دیکھا ہے۔ بے خودی کے عالم میں ان کو گھر نہ واپس جانے کی ضد ہوتی تھی۔ جب ایسی صورتِ حال پیدا ہوتی تھی تو مجھے اس فرض پر مامور کیا جاتا تھا کہ آدھی آدھی رات کو میں ان کو گھر پہنچاؤں۔ وہ بڑا لحاظ کرتے تھے۔ منافقوں کے علاوہ سب کا لحاظ کرتے تھے۔ گھر واپس جانے سے انکار کرتے رہتے تھے۔ لیکن جاتے تھے۔

صرف چند برس لکھنؤ میں اُن سے قربت کی سعادت رہی۔ اس میں وہ وقفہ بھی ہے، جب وہ ۱۹۵۲ء میں نروس بریک ڈاؤن کے علاج کے بعد لکھنؤ آئے۔ سہیل عظیم آبادی اُن کو رانچی کے شفاخانے سے لے کر آئے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ وہ صحت یاب ہو گئے ہیں۔ لیکن .....ان کی چھوٹی بہن صفیہ کا انتقال لکھنؤ میں ہوا۔ یہ بڑا صدمہ تھا۔ اور ہم نے محسوس کیا کہ اس صدمے کی وجہ سے زیادہ سنجیدہ اور نارمل ہوئے۔

رانچی کے شفاخانے میں مجاز شعر بھی کہتے رہے۔ ماہرینِ نفسیات کے لیے، یہ اچھی کیس اسٹڈی ہو سکتی ہے۔ محمد حسن نے ایک بڑا کام یہ کیا کہ ساری تحریریں فراہم کر لیں، اور عصری ادب کے ایک شمارے میں انہیں شائع بھی کیا۔

مجاز نے فارسی میں بھی ایک غزل کہی تھی، اور سرور کے عالم میں کبھی کبھی سنایا کرتے تھے۔ صرف ایک مصرعہ یادداشت میں ہے۔

من آہوئے شکارم، جانب دشت شکارایم

حافظ کے عاشقوں میں سے تھے۔ خاص طور سے ایک غزل سرمستی کے عالم میں اکثر پڑھتے تھے، اور مطلع پڑھتے وقت اُن کا داہنا ہاتھ پشت سر بال چھوتا تھا، اور قوس بناتا ہوا بازو کی طرف جاتا تھا:

اے کہ با سلسلۂ زلفِ دراز آمدۂ
فرصتت باد کہ دیوانہ نواز آمدۂ

کچھ عرصے تک، سرور کے عالم میں وہ یہ شعر اپنے مخصوص ترنم میں پڑھتے رہتے تھے:

تیز رکھیو سر ہر خار کو اے دشتِ جنوں
آبی نکلے گا کوئی آبلہ پا میرے بعد

ان کو یہ شعر کہیں سے ملا تھا اور وہ اسے خدائے سخن میر تقی میر کے نشتروں کے زمرے میں رکھتے تھے۔ قاضی عبدالودود نے اس کو آوارہ گرد اشعار کے زمرے میں رکھا۔ لیکن مصحفی کے تذکرے ریاض الفصحا میں یہ شعر محمد تقی خاں ہوسؔ کے ترجمے میں درج ہے۔

حافظ کا ایک اور شعر، جو مجاز سرشاری کے عالم میں پڑھتے تھے یہ ہے:

گدا سے میکدہ ام، لیک وقت مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم برستادہ کنم

مجاز اور جذبی کو سرینگر کے ایک مشاعرے میں بلایا تھا۔ ان کا قیام میرے یہاں رہا، وہ چند روز یادگار ہیں۔

شاعروں میں جگر مرادآبادی اور مجاز جیسے شریف النفس بے ریا انسان میں نے زندگی میں نہیں دیکھے۔

اقبال نے کہا تھا اپنے بیٹے جاوید کو مخاطب کر کے:

اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

قافیہ بدل کر مجاز نے کہا:

جو ہو سکے، ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے، تو ہمارا جو رب پیدا کر

اپنے ہر پس رو کے لیے مجاز کا یہی رویہ تھا۔ وہ آزاد شاعری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ میرے لیے بڑی پریشانی کی بات تھی کہ مجاز کی خاطر پر میرا آزاد نظم کے تجربے کرنا گراں گزرتا تھا۔ مجاز کے نام میں نے ایک نظم لکھی۔ آزاد نظم۔ لیکن اُن کو سنانے کی ہمت

نہیں ہوئی۔ یہ نظم بادبان میں شامل ہے۔ مجاز کو خراجِ عقیدت کے طور پر آپ کے سامنے پیش کروں گا۔ اس اتفاق کی طرف بھی آپ کو توجہ دلانا چاہوں گا کہ ۱۹۸۴ء میں اختر حسین رائے پوری نے مجاز کی زندگی کا جو تجزیہ کیا، اور جو نقل کیا جا چکا ہے، میری نظم، جو ۱۹۴۴ء میں لکھی گئی تھی، تاثرات کے اعتبار سے بہت مختلف نہیں ہے۔

عابد سہیل

مجاز اور شامِ غریبانِ لکھنؤ

مجاز کو میں نے پہلی بار ڈاکٹر محمد حسن کے یہاں دیکھا تھا۔ یہ ۱۹۴۹ء کے آخر یا ۱۹۵۰ء کے شروع کی بات ہے۔ محمد حسن لاٹوش روڈ کی پشت پر اس گلی کے پاس جو اسے امین آباد سے ملاتی ہے، ایک چھوٹے سے میدان کے سامنے کے دومنزلہ مکان میں رہتے تھے۔ وہ کئی طرح سے جانے جاتے، نوجوان ادیبوں کے میرِ کارواں، ریڈیو کے ڈرامہ نگار، پائینیر کے ہفت روزہ ''فلم میل'' کے ایڈیٹر، یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے عارضی لکچرر اور سب سے زیادہ مجاز کے عاشق۔ مجاز بھی انہیں بہت عزیز رکھتے۔

مجاز اپنے آپ میں کھوئے رہتے اور کسی سے ملاقات میں پہل نہ کرتے۔ سارے نوجوان ادیبوں کو مجاز سے متعارف محمد حسن ہی نے کرایا تھا۔ احمد جمال پاشا کی مزاح نگاری کا ابتدائی دور تھا۔ جمال کوئی مزاحیہ لکھتے تو پہلے اپنے ایک دوست کو دکھاتے جو ان سے ایک آدھ سال قبل ادب کی دنیا میں داخل ہوئے تھے۔ اس کے بعد محمد حسن کے سامنے پیش کرتے اور وہاں سے ہری جھنڈی ملنے کے بعد ہی کہیں چھپنے کے لیے

بھیجتے۔ یہ کام بھی محمد حسن ہی کے مشورہ پر ہوتا۔

ایک دن میں، حسن عابد، جمال اور غالباً آفتاب اختر کافی ہاؤس سے مے فیر کی جانب جا رہے تھے اور پرانے یونیورسل کے سامنے دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر تھے کہ مجاز آتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے جمال کو دیکھتے ہی کہا، ''خوب لکھتے ہو بھائی، خوب لکھتے ہو۔'' ان کے اس جملہ سے پتہ چلا کہ محمد حسن نے کسی نہ کسی طرح انہیں جمال کا کوئی نہ کوئی مزاحیہ سنوا ہی دیا ہے۔ شاید یہ کام حسن عابد نے کیا تھا۔ یہ بات کسی نے مجھے بتائی نہیں لیکن حسن عابد کے چہرہ کی چمک اس کی گواہی دے رہی تھی۔

فرحت اللہ انصاری ''نیا دور'' کے ایڈیٹر تھے، ایڈیٹر تو خیر علی جواد زیدی کے دہلی چلے جانے کے بعد محکمہ کے غیر اردو داں ڈائرکٹر ہو گئے تھے لیکن کام سارا فرحت اللہ انصاری ہی دیکھتے۔

شام کا وقت تھا اور فرحت صاحب اپنی مخصوص قسم کی چھڑی پر، جس سے ٹیک لگا کے ستایا بھی جا سکتا تھا، آدھے جسم کا تھوڑا سا بوجھ ڈالے سڑک پار کر کے برٹش بک ڈپو کی جانب والے فٹ پاتھ پر داخل ہوئے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ مجاز دوسری طرف سے آ رہے تھے۔ ان کی نظر مجاز پر پڑی تو انہوں نے اپنی مخصوص ہنک کے ساتھ ان کو مخاطب کیا، ''کوئی نئی غزل کہی؟''۔

''ایک غزل.....'' مطلب یہ تھا کہ کچھ شعر ہو گئے ہیں۔

''جلدی سے مکمل کرو.....اور ہاں سہیل تم تقاضہ کرتے رہنا اور ایک ہفتے میں غزل مجھے مل جائے۔''

فرحت صاحب کے انداز گفتگو پر مجھے سخت حیرت تھی۔ میں حیران تھا کہ کوئی مجاز سے بھی اس طرح بات کر سکتا ہے۔ اس وقت مجھے فرحت اللہ انصاری اور مجاز کے تعلقات کا قطعاً علم نہ تھا۔ پھر معلوم ہوا کہ مجاز تھوڑے بہت بھی اپنے ہوش میں ہوتے ہیں

اور اس حالت میں گھر جا کر اپنی ماں کا دل نہیں دکھانا چاہتے تو نیو حیدر آباد کے بجائے فرنگی محل کا رخ کرتے ہیں۔

فرنگی محل میں فرحت صاحب کے دو مکان تھے۔ وہ اس مکان کا جو کنویں سے بالکل لگا ہوا تھا، دروازہ کھٹکھٹاتے۔ ان دنوں فرنگی محل میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے مجاز کو رات گئے عالم کیف میں وہاں نہ دیکھا ہو۔ ایک عینی شاہد لطیف صدیقی خدا کے شکر سے حیات ہیں۔ پھر دونوں کی قربت کی مزید تصدیق اس مشہور مضمون سے ہوئی جو فرحت صاحب نے مجاز کے انتقال کے بعد ان پر لکھا تھا۔

کئی بار یاد دلانے کے بعد مجاز نے غزل میرے حوالے کی جو "نیا دور" میں پورے صفحہ پر شائع ہوئی۔ اشعار شاید پانچ یا چھے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ غزل نئی تھی یا پرانی لیکن جہاں تک یاد ہے "آہنگ" کے اس وقت کے ایڈیشن میں نہیں تھی۔ تین شعر اب بھی یاد ہیں، ایک شعر تو پیمبرانہ (Prophetic) ہے۔

تیری آواز آئی آسماں سے　　مگر میں جانب دل دیکھتا ہوں
اشارہ ہے ترا طوفاں کی جانب　　مگر میں ہوں کہ ساحل دیکھتا ہوں
مجاز اور مے کدہ میں سر بہ زانو　　مآلِ زعمِ باطل دیکھتا ہوں

میرا خیال ہے یہ واقعہ ۱۹۵۳ء یا ۱۹۵۴ء کا ہے یا اگلے سال کا لیکن یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں نے ان اشعار کو ہمیشہ ۵ مئی ۱۹۵۵ء کے اس المیہ سے جوڑ کے دیکھا ہے جس نے اس وقت کے شہر طرب، یعنی لکھنؤ میں صفِ ماتم بچھا دی تھی۔

مجاز لکھنؤ میں ہوتے تو ہم لوگ یعنی میں، احمد جمال پاشا، عارف نقوی، حسن عابد، آغا سہیل اور دو چار دوسرے طلبہ جن کے نام اب یاد نہیں اکثر و بیشتر ڈھائی تین بجے سائنس فیکلٹی والے گیٹ سے ہوتے ہوئے بیربل ساہنی انسٹی ٹیوٹ کے سامنے پہنچ جاتے اور کبھی کبھی مجاز نیو حیدر آباد سے آتے ہوئے نظر آ جاتے۔ وہ سڑک کے موڑ پر چڑھی

صاحب کے مکان کے سامنے کے فٹ پاتھ پر ایک بڑھیا کی چھوٹی سی دوکان سے قینچی سگریٹ کی ڈبیا اور دیا سلائی خریدتے۔ بس فوراً آجاتی تو حضرت گنج یا کسی اور جگہ کے لیے روانہ ہو جاتے اور ہم لوگوں پر نظر پڑ جاتی تو بس کا انتظار کرنے کے بجائے شعبۂ اردو آجاتے جو اُن دنوں یونیورسٹی کی اصل عمارت کے اس کمرے میں تھا جو بعد میں کامن روم بنا دیا گیا تھا۔

ان دنوں ہم ان کا ایک مصرع دہرایا کرتے جو اس طرح تھا:

کرنل نہیں ہوں خان بہادر نہیں ہوں میں

لیکن ہمیں دوسرے مصرعے یا باقی اشعار کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ اس وقت یہ بھی نہ جانتے تھے کہ ''کرنل'' سے اشارہ کس جانب مقصود ہے لیکن معلوم نہیں کیسے یہ اندازہ تھا کہ یہاں ''خان بہادر'' کے معنی نواب جعفر علی خاں اثر ہیں، شاید یوں کہ وہ ترقی پسندی کے ہم نوا کم اور نکتہ چیں زیادہ تھے۔

برسوں بعد معلوم نہیں کہاں سے مجھے ایک لیٹر ہیڈ مل گیا جس پر وہ مصرعے جس سے ہم لوگ واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ مجاز کے ہیں، لکھا ہوا تھا، اور وہ بھی مجاز ہی کی تحریر میں۔

اس لیٹر ہیڈ کے بائیں کونے پر ایک نقش میں Alabore Canstantia لکھا ہوا ہے اور نیچے ''عرض نیاز'' کے عنوان سے درج ذیل قطعہ:

پیمانۂ حیات ہوں گو پُر نہیں ہوں میں
افغاں نہیں ہوں، ترک نہیں (ہوں) حر نہیں ہوں میں
ہے ناز مجھ کو عصمتِ تخئیل پر بہت
یہ بھی ہے مجھ کو فخر کہ ''بے سُر'' نہیں ہوں میں
شاعر ہوں اور امین عروسِ سخن کا ہوں

کرنل نہیں ہوں، خان بہادر نہیں ہوں میں

داہنی جانب ذرا سا نیچے ان کے دستخط ہیں (اسرار الحق مجاز) اور اس کے بعد اوپر سے نیچے کی جانب لکیر کھینچ کر تین سطروں میں انہوں نے لکھا ہے، ''یہ چند اشعار آنند نرائن ملا صاحب کے نذر کرتا ہوں جن کا عشقِ وطن مسلّم سمجھتا ہوں اور شاعرِ اعظم۔''

لیٹر ہیڈ پر کوئی تاریخ تو درج نہیں لیکن گمان غالب ہے کہ یہ تحریر ان دنوں سے پہلے کی ہے جب وہ اردو کے بہترین شعرا کے ناموں کے ساتھ اپنے علاوہ کسی اور کا نام گوارہ نہ کرتے تھے۔

اصل تحریر تو میں نے کئی دوسری چیزوں کے ساتھ جامعہ ملّیہ کے ''گوشۂ مجاز'' کے لیے بھیج دی تھی لیکن اس کی فوٹو کاپی محفوظ تھی، جو حاضر ہے۔

کافی ہاؤس کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے لیکن شنیدہ ہے، دیدہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

ایک دن کافی ہاؤس میں سلام مچھلی شہری نے ڈاکٹر عبدالعلیم سے پوچھا، ''ڈاکٹر صاحب Dialectical Materialism کا ترجمہ کیا ہوگا؟''

علیم صاحب نے کہا، ''جدلیاتی مادّیت مروّج ہے ویسے صحیح ترجمہ تو،'' انہوں نے داڑھی کھجائی، تھوڑا سا سوچا، پھر کہا ''صحیح ترجمہ تو.....''

سب لوگ گوش برآواز ہو گئے۔

علیم صاحب نے ایک بار پھر سوچا اور کہا 'صحیح ترجمہ تو' فلسفۂ ارتقائے اجتماع بالضدین، ہوگا''

مجاز نے جو بہت دیر سے خاموش بیٹھے تھے، نہایت معصومیت سے پوچھا۔

''ڈاکٹر صاحب یہ خواجہ غلام السیدین کے بڑے بھائی تو نہیں ہیں!''

بات ہنسنے کی نہیں قہقہہ لگانے کی تھی۔ لوگوں نے یہ قہقہہ بعد میں ضرور لگایا ہوگا۔

مجاز کو میں نے پہلے پہل اس وقت دیکھا جب وہ اپنی زندگی کے بہترین دنوں کی

بھولی بسری یاد بن چکے تھے۔

پھر بھی وہ کافی ہاؤس میں اس وقت تک داخل نہ ہوتے جب تک جیب میں قینچی سگریٹ کی ڈبیا، دیا سلائی اور دو چار لوگوں کو کافی پلانے کے پیسے نہ ہوتے اور کافی ان دنوں پانچ آنے کی ملتی تھی۔ دوسروں کی پیش کی ہوئی کافی تو وہ قبول کر لیتے، لیکن کسی سے اس کے لیے کہتے یا سگریٹ مانگنے میں نے ان کو کبھی نہ دیکھا۔ تاہم یہ سب اس وقت کی باتیں تھیں جب وہ اپنے آپے میں ہوتے۔ میں نے کسی اور عالم میں ان کو کبھی نہیں دیکھا، الّا ایک بار کے۔

یہ اس رات کی بات ہے جب منکی برج پر ایک نوجوان کو قتل کر دیا گیا تھا۔ میں اسی رات ساڑھے بارہ بجے اپنے دوست شری چند کے کمرے سے گھر جا رہا تھا۔ پل پر مکمل سناٹا۔ اس سناٹے میں ایک دردناک آواز گونجی... ''ماں'' اور پھر یہ آواز بار بار ابھری اور ڈوبی۔

یہ آواز مجاز کی تھی۔ میں سائیکل پر تھا۔ وہ رکشے پر۔

تیسرے دن ڈاکٹر محمد حسن نے بتایا تھا کہ یہ قتل تو محض مشق تھا اور اسی رات اسی پل پر اصل شخص کا قتل ہوا۔ یہ دور وہ تھا جب آزادی کے بعد ملک میں تعمیراتی کاموں کا سلسلہ زور شور سے شروع ہو گیا تھا اور ان کاموں سے حاصل ہونے والے کالے دھن سے فیضیاب ہونے والے نو دولتیوں کی اولادوں نے دولت اور جرم کی آمیزش کی داغ بیل بس ڈالی ہی تھی۔ لیکن یہ نوجوان اس وقت تک کافی ہاؤس میں داخل ہونے کی ہمت نہ کر سکے تھے، اگرچہ شہر کے بڑے سے بڑے ہوٹل ان کی دسترس میں تھے۔

مجاز اپنی ماں کو بہت چاہتے اور اپنی ذات سے انہیں پہنچنے والے دکھ پر کڑھتے، آنسو بہاتے لیکن گلاس کے سامنے آتے ہی سب کچھ بھول جاتے اور دارالسراج جاتے ہوئے، پیدل ہوں یا رکشے پر، ''ماں، ماں'' کی دردناک، کربناک آوازوں سے خود کو

شرمسار کرتے یا اپنے دل کا بوجھ ہلکا۔

اس وقت بھی شہر میں ایسے لوگ ضرور رہے ہوں گے جنہوں نے مجاز کا نام تک نہ سنا ہوگا لیکن وہ جو خود کو پڑھا لکھا ثابت کرنا چاہتے یا پڑھے لکھوں کا شناسا اور مجاز سے واقف ہونا اور یہ ممکن نہ ہو تو کم سے کم یہ ظاہر کرنا کہ وہ انہیں جانتے ہیں ضروری سمجھتے اور اس سے زیادہ یہ کہ مجاز ان کے صورت آشنا ہیں۔

ان دنوں جب محمد حسن پی۔ایچ۔ڈی۔کر رہے تھے انہوں نے یونیورسٹی میں ''حلقۂ احباب'' نام کی ایک ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی تھی۔ ایک جلسہ میں پروفیسر کالی پرشاد نے، جن کی مادری زبان اردو تھی، نفسیات کے کسی پہلو پر ایک مقالہ سنایا۔ اسی وقت شعبۂ نفسیات کی کئی طالبات بھی آبراجیں۔ مجاز کے مقابل جو طالبہ بیٹھی تھی ان میں سب سے حسین و جمیل اور نمایاں تھی۔ لوگ مقالہ سنتے رہے اور مجاز اپنے مدمقابل میں محو۔ مباحثے کے بعد دوسرے مقالہ کا نمبر آیا تو شعبۂ نفسیات کی طالبات رخصت ہونے لگیں۔ ظاہر ہے ان میں وہ لڑکی بھی تھی جو مجاز کے تقریباً سامنے بیٹھی تھی۔ مجاز نے احتشام صاحب کو مخاطب کر کے برجستہ کہا:

احتشام یہ شعر ابھی ابھی ہو گیا ہے۔

کون اٹھ کر چلا مقابل سے
جس طرف دیکھیے اندھیرا ہے

احتشام صاحب مسکرا کے رہ گئے۔

مجاز پر منظر سلیم کا ایم۔اے کا مقالہ ''مجاز۔حیات اور شاعری'' کا پہلا ایڈیشن کتاب پبلشرز نے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب خاصی تیزی سے فروخت ہو گئی۔ اس کے گرد پوش کی پشت پر منظر سلیم کی چھوٹی سی تصویر تھی اور اس کے نیچے کتاب اور منظر سلیم کے بارے میں ایک مختصر سی عبارت۔ اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت آئی تو میں آخری

صفحہ کی سابقہ صورت برقرار رکھنا چاہتا تھا لیکن پریشانی یہ تھی کہ منظر سلیم کی اصل تصویر کہیں کھو گئی تھی، مطبوعہ تصویر دھندھلا گئی تھی اور منظر سلیم تاشقند میں تھے۔ میں کسی ایسے پریس کی تلاش میں تھا جو تصویر صاف ستھری چھاپ دے۔ کسی نے قیصر باغ اور لال باغ کے درمیان نور منزل کی پشت پر ایک پریس کا نام بتایا جس کی ان دنوں خاصی شہرت تھی۔ پریس کا نام مجھے اب تک یاد ہے۔ میں وہاں گیا تو اس کے مالک میرے شناسا نکلے۔ میں جانتا تھا کہ وہ خود کو علم نجوم، علم رمل، دست شناسی اور علم ہندسہ کا ماہر سمجھتے ہیں۔ کم سے کم وہ ظاہر یہی کرتے۔

انہوں نے منظر سلیم کی تصویر دیکھی، ایک ٹھنڈی سانس بھری اور کہا، ''میں نے تو پہلے ہی بتا دیا تھا، مجاز تمہاری موت شراب خانے میں جاڑوں کی ٹھٹھرتی رات میں ہوگی۔'' منظر سلیم کی کتاب کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔

میں ان کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ وہ منظر سلیم کی تصویر کو مجاز کی تصویر سمجھ رہے تھے... یہ تھا مجاز کی مقبولیت کا عالم، ان کے انتقال کے تیس برس بعد تک، اور آج یہ حالت ہے کہ خود مجاز کافی ہاؤس میں جا کر بیٹھ جائیں تو کوئی انہیں پہچان کے نہ دے..... علاوہ اسکے کہ مدرار اکھشس، شارب ردولوی، لطیف صدیقی، عابد سہیل اور دو چار دوسروں میں سے کوئی، اتفاق بلکہ حسن اتفاق سے وہاں موجود ہو۔

محمد حسن غالباً ۱۹۵۰ء کے آخر میں علی گڑھ چلے گئے لیکن مہینے دو مہینے میں ایک آدھ بار چکر لگاتے رہتے۔ مجاز تیسری بار پاگل خانے سے واپس آ چکے تھے اور اب شراب پینے سے احتراز برتتے۔ لیکن خود سے کیے جانے والے سارے عہد و پیمان ان بلانوشوں کے سامنے جو ان کی موجودگی سے اپنی محفلوں میں رنگ بھرتے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے ڈھیر بن جاتے۔ محمد حسن ان سے ملنے گئے تو والدہ کو سلام کہلا بھیجا۔ ان کی والدہ چق کے پاس آ گئیں اور انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''بھیا اب تم سب تو چلے گئے۔ یہاں

ان کو نئے دوست مل گئے ہیں پھر انہیں پلانی شروع کردی ہے۔ میں تو ان کے علاج میں تباہ ہوگئی۔ تمہیں ان کو سمجھاؤ۔ محمد حسن نے انہیں دلاسہ دیا لیکن مجاز سے کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکے۔ مجاز بھی بہت متاثر تھے۔ خاموش بیٹھے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے رہے اور بولے بنّے بھائی آئے ہوئے ہیں، ملنے چلتے ہو۔

سجاد ظہیر انہیں دنوں پاکستان سے آئے تھے۔ محمد حسن راضی ہوگئے۔ دونوں نشاط گنج سے ہوتے ہوئے وزیر منزل پہنچے۔ بنّے بھائی خط لکھ رہے تھے۔ ان لوگوں کو بٹھایا اور کہا، ''ذرا کپڑے بدل لوں، تم لوگ دیوان حافظ دیکھو۔ نیا ایڈیشن ایران سے ابھی آیا ہے۔'' محمد حسن دیوانِ حافظ کی ورق گردانی کرنے لگے۔ مجاز نے کہا، ''دیوانِ حافظ سے لوگ فال بھی تو نکالتے ہیں۔'' محمد حسن نے کہا، ''ہاں نکالتے تو ہیں۔''

مجاز نے کہا ''تو فال نکالو''

انہوں نے پوچھا ''کس بات کی۔''

بولے بس یوں ہی نکالو۔

محمد حسن نے فال نکالی تو یہ شعر آیا

تا زِ مے خانہ و مے نام و نشاں خواہد بود
سرِ ما خاکِ رہِ پیرِ مغاں خواہد بود

محمد حسن نے پوچھا ''کس بات کی فال نکالی تھی۔''

بولے ''شراب چھوٹے گی یا نہیں۔''

لیکن شراب نے بھلا کسی کو چھوڑا ہے جو مجاز کو چھوڑتی۔ آخر اسی خاکِ رہِ پیرِ مغاں اور ان کے ستم ظریف دوستوں کی سازش نے انہیں لال باغ کے ایک دیسی شراب خانے پہنچا دیا اور ۴؍دسمبر ۱۹۵۵ء کی برفانی رات میں ۳ بجے انہیں چھوڑ کر خود رخصت ہوگئے۔ اگلے دن مے خانہ کھلا تو وہ کھلی چھت پر بے ہوش پڑے تھے۔ فوراً انہیں بلرامپور

اسپتال میں داخل کیا گیا لیکن الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا۔ اگلی شام دارالسراج سے روانہ ہونے والے جنازہ میں شہر کا ایک ایک ادیب، وہ اردو کا ہو یا ہندی کا، پینٹرس، فنون لطیفہ سے دلچسپی لینے والے اور یونیورسٹی کے درجنوں طلبہ، غرض ہزار سوا ہزار افراد شامل تھے۔

تیسرے دن رفاہ عام کلب کے کھچا کھچ بھرے ہال میں تعزیتی جلسہ ہوا۔ کچھ اپنی تقریر مکمل کر سکے، کچھ چند لفظ کہہ کے جذبات سے مغلوب ہو گئے۔ عصمت چغتائی نے ہوش و حواس پر قابو رکھا اور اپنی تقریر اس طرح ختم کی۔

میں نے اکثر مجاز کو اس کی بعض عادتوں پر ڈانٹا اور کبھی غصے میں کہا۔

''اس سے بہتر تو ہے مجاز کہ تم مر جاتے۔''

مجاز نے جیسے مُنہ پر طمانچہ مار دیا اور کہا،

''لو میں مر گیا۔ تم اس کو اتنا بڑا کام سمجھتی تھیں۔''

اس موقع پر گلوگیر آواز میں منظر سلیم نے جو نظم پڑھی تھی اس کا ایک شعر تھا:

میں نہیں ہوں تو مرے چاہنے والے ہیں بہت
واہ کیا خوب چلی رسمِ وفا میرے بعد

مجاز۔ شاعرِ محفلِ وفا اور مُطربِ بزمِ دلبراں

ترقی پسند تحریک کے دو اہم نام ہیں معین احسن جذبی اور اسرار الحق مجاز لکھنوی۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان دونوں اہم شاعروں پر جتنا کام ہونا چاہیے تھا اب تک نہیں ہوا۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ان دونوں معتبر شاعروں پر مزید کام کیا جائے۔ مجاز کو خدا نے جینے کی زیادہ مہلت نہیں دی اور اُسے جلدی ہی اپنے پاس بلا لیا لیکن ترقی پسند تحریک اور اُردو ادب کو جو کچھ اس سے ملا اس پر ہم سب فخر کر سکتے ہیں۔

کچھ برس پہلے مجاز کی چھوٹی بہن حمیدہ سالم صاحبہ نے ایک کتاب لکھی تھی اور اس کے بعد دوسری کتاب صہبا لیاقت علی صاحبہ نے ''مجاز کی باتیں'' کے عنوان سے مرتب کی ہے۔ میں نے اس کتاب کو غور سے پڑھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ صہبا لیاقت علی نے اس کو بڑی محنت سے ترتیب دیا ہے۔

کتاب کے آخر میں جو تصویریں صہبا نے جمع کر کے اس میں شامل کی ہیں وہ بڑی قیمتی ہیں۔ خاص طور پر وہ تصویر جو مجاز نے اپنے دستخطوں کے ساتھ صہبا کو دی تھی وہ تو

بے حد خوبصورت تصویر ہے۔ مجاز کے یہ دو شعر جو اُس نے ۴ر جولائی ۱۹۵۰ء کو کہے تھے بہت ہی دلکش ہیں۔ میں اپنی بات ان ہی شعروں سے شروع کر رہا ہوں۔

میری دنیائے وفا میں کیا سے کیا ہونے لگا
اک در چہ بند مجھ پر، ایک وا ہونے لگا
اک نگار ناز کی پھرنے لگیں آنکھیں مجاز
اک بُت کافر کا دل درد آشنا ہونے لگا

مجاز سے میری پہلی ملاقات جس کی تفصیل مجھے آج تک یاد ہے وہ محلہ پُل بنگش کی ایک گلی کے اس مکان میں ہوئی تھی جو تقسیم وطن کے بعد ساحر لدھیانوی کو الاٹ ہوا تھا۔ اسی گلی میں شروع کے دو تین منزلہ مکانوں میں جوش صاحب بھی رہتے تھے۔ جس صبح کا میں ذکر کر رہا ہوں اس سے پہلی رات کو ایک مشاعرہ تھا، جس میں تقریباً سارے ہی نامور شاعر موجود تھے۔ مشاعرہ کافی دیر تک چلتا رہا تھا۔ مشاعرہ کے اختتام پر میں بھارگو لین تمیں ہزاری میں ایک عزیز کے ہاں آ گیا اور وہیں سے صبح تیار ہو کر ساحر سے ملنے محلہ پُل بنگش میں آیا تھا۔ میں نے مکان کے اندر داخل ہو کر امّی کو سلام کیا اور اُن سے ساحر کے بارے میں پوچھا۔ امّی نے کہا کہ وہ ساتھ کے کمرے میں سویا پڑا ہے اور مجاز بھی اُسی چارپائی پر لیٹا ہوا ہے۔ میں نے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا دونوں گہری نیند سو رہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر سکون و اطمینان اس طرح کھنڈا ہوا تھا کہ وہ ایسے دو معصوم بچے نظر آ رہے تھے جو کھیلتے کھیلتے تھک گئے ہوں اور پھر سو گئے ہوں۔ میں نے ان دونوں کو ڈسٹرب نہیں کیا۔ امّی کے پاس بیٹھ کر ان کی دعائیں لیتا رہا اور جب میں اُٹھ کر آنے لگا اس وقت ساحر کی آنکھ کھلی تھی اور جب امّی نے اسے بتایا کہ میں دیر سے اس کے جاگنے کا انتظار کر رہا تھا تو وہ فوراً اٹھ کر آیا اور گلے سے لگ کر۔ اس نے کہا کہ مشاعرہ سے آ کر وہ اور مجاز کافی دیر تک جاگتے رہے تھے اور اسی لیے اب تک اُن کی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ پھر اس نے مجاز کو بھی جگایا۔ مجھے لگا

مجاز کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ ابھی تک اس کی آنکھوں میں نیند کے ہلکے ہلکے ڈورے لہرا رہے تھے جن میں خمار کا ہلکا ہلکا عکس اب بھی موجود تھا۔ رات کے مشاعروں میں مجاز نے اپنی نظم ''آوارہ'' پڑھ کر مشاعرہ لوٹ لیا تھا اور رات وہ ساحر کے ساتھ ایک چارپائی پر فاتح کے سے انداز میں فخر و اطمینان سے سویا پڑا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجاز کی نظم ''آوارہ'' وہ نظم ہے جو اُسے قیامت تک زندہ رکھ سکتی ہے۔

میں اس نظم کا کچھ حصہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سُلطانِ جابر نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اُس کا گلشن پھونک دوں اُس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا، میں سارا قصرِ سلطان پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

مشاعرہ کے سلسلہ میں مجھے جاں نثار اختر کے ایک مضمون کا دھیان آ رہا ہے جو صہبا جی کی کتاب میں درج ہے۔ ''مجاز۔ میرا دوست میرا مہمان'' اسی مضمون کا اقتباس پیش کر رہا ہوں۔

''یہ سنہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ مجاز ان دنوں ہارڈنگ لائبریری میں کام کرتا تھا اور میں وکٹوریہ کالج گوالیار میں لکچرار تھا۔ کالج میں ہر سال دسمبر کے مہینے میں سالانہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ لیکن بزمِ ادب کا فنڈ بہت ہی مختصر اور محدود تھا، اس لیے بیرونی شعراء میں سے ایک دو ہی کو مدعو کیا جا سکتا تھا۔ اس سال بزم ادب نے صرف مجاز کو بلانے کا فیصلہ کیا، اور مجاز میرے خط کے بعد گوالیار آنے کے لیے مجبور ہو گیا۔

مجاز پہلی بار ہم لوگوں کے گھر آ رہا تھا۔ صفیہ کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ مجاز کو لینے خود اسٹیشن گئی۔ مجھے دو دن سے بخار آ رہا تھا۔ اس لیے اُس نے مجھے جانے کی اجازت نہ دی۔ مجاز آئے اور گھر کی رونق میں دُونا اضافہ ہو گیا۔ اس کے آتے ہی ہمارے گھر میں لوگوں کا جم گھٹا ہونے لگا۔ مقامی ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ شہر کی کتنی ہی ادب نواز خواتین بھی اُسے دیکھنے اور اس سے ملنے کے لیے غیر متوقع طور پر ہمارے یہاں جمع ہو گئیں۔ مجاز کی شاعری میں جو لطیف رومانی عنصر ہے، اس نے مجاز کو خواتین کے حلقے میں ہمیشہ حد سے زیادہ مقبول اور ہر دل عزیز رکھا ہے۔ وہ خود کو اگر ''شاعرِ محفلِ وفا، مطربِ بزمِ دلبراں'' کہتا تھا تو اس کا یہ دعویٰ غلط نہ تھا۔''

اسی مضمون سے دوسرا اقتباس پیش کرتا ہوں:

''قلعہ ہاتھرس میں وار فنڈ کے سلسلے میں ایک مشاعرہ تھا۔ خاصی تعداد میں شاعر آئے تھے۔ دوسری صبح چائے پی جا رہی تھی کہ تحصیلدار صاحب نے سب شاعروں کو بلوا بھیجا۔ خود ایک کرسی پر تشریف رکھتے تھے۔ برابر میں ایک لوہے کی تپائی پر منشی جی بیٹھے تھے۔ جب شاعر جمع ہو گئے تو تحصیلدار صاحب نے نام پکارنے کے لیے کہا۔ منشی جی نے شاعر کا نام پکارا۔ وہ آگے بڑھا۔ تحصیلدار صاحب نے سوال کیا۔ ''آپ سے کیا رقم طے ہوئی تھی؟'' وہ کچھ ہچکچایا تو انہوں نے ذرا ڈانٹ کر کہا۔ ''بتایئے کیا طے ہوا تھا؟'' ''مجبوراً اُسے بتانا پڑا۔ دو سو روپیہ'' تحصیلدار صاحب نے منشی جی کو حکم دیا۔ آپ کو صرف ایک سو ساٹھ

روپے دیجئے۔ غرض سب ہی کا یہ حشر ہوتا رہا۔ شعرا نے جائے قیام پر پہنچ کر بہت شور وغل مچایا۔ ابھی یہ شور وغل جاری تھا کہ تحصیلدار صاحب کے ایک آدمی نے آکر اطلاع دی کہ باتھرس کی بس تیار ہے۔ سب شعرا صاحبان اسی بس میں چلے جائیں، ورنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔

دو دن کے بعد مجاز کو واپس آنا تھا اس نے جاں نثار اختر سے کہا۔ اگر واپسی کا کرایہ مل جائے تو میرے لیے آسانی رہے گی۔ مجاز، جاں نثار اختر کا یہ جواب سن کر مطمئن ہوگیا کہ اس کے معاوضے کے پیسے صفیہ کے پاس رکھے تھے۔ چلتے وقت جب صفیہ نے چالیس روئے لاکر دیے تو اُس نے وہ روپے لے لیے اور بولا کچھ نہیں۔ صفیہ نے اس سے کہا کہ معاوضہ کے جتنے پیسے ملے تھے اُن سے اُس نے مجاز کے کپڑے سلوا کر بکس میں رکھ دیے تھے۔ اور اُسے کپڑوں کی ضرورت نہیں تو صفیہ بولی۔ ''وہ تو مجھے پتہ ہے آپ کے پاس جتنے کپڑے ہیں۔''

مجاز نے جواب دیا ''تم بھی تحصیلدارنی سے کم نہیں ہو۔''

مجاز کا یہ جواب سن کر جاں نثار اختر اور صفیہ دیر تک اس فقرے کا لطف لیتے رہے۔

مجاز کی موت پر کچھ دوستوں اور دانشوروں نے اس کے بارے میں اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ میں ان میں سے کچھ تاثرات کے اقتباسات اس مضمون میں درج کررہا ہوں۔ جوش ملیح آبادی نے اپنے مضمون ''مرگِ مجاز'' کا آغاز ان الفاظ سے کیا ہے۔

''مرگِ مجاز کی خبر نے دل کو برباد کر کے رکھ دیا۔ کاش وہ
زندہ رہتا، میں مرجاتا ہائے، ہائے'' (جوش ملیح آبادی)

سید احتشام حسین کے مضمون ''مجاز، فکر وفن کے چند پہلو'' کی آخری سطور پیش کررہا ہوں:

''مجاز نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ شاعری میں
تازگی، گرمی اور اثر محض تجربوں سے نہیں خلوص، مقصد کی

عظمت، الفاظ کے فنکارانہ صرف اور فنی روایات کے تخلیقی استعمال سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے مجاز کی شاعری چاہے عظیم نہ ہو پُر اثر، پُر سحر اور پُر کار ضرور ہے۔ یہی چیز انہیں اُردو کا مقبول اور جوانوں کا محبوب شاعر بناتی ہے۔''

آل احمد سرور کے مضمون ''مجاز: رومانیت کا شہید'' کی آخری سطور پیش کر رہا ہوں:

''وہ ایک شہاب ثاقب کی طرح ہمارے ادبی اُفق پر رونما ہوا تھا۔ اُس کی روشنی بڑی نظر نواز تھی۔ دیکھتے دیکھتے، سستی داد، طبیعت کی کمزوری اور خوابوں کی موجودہ پست اور کاروباری دنیا میں کوئی قیمت نہ ہونے کی وجہ سے اس شعلے کو زمانے کی نظر کھا گئی۔ مگر اس نے ہمیں درد و داغ، آرزو اور جستجو کا جو خزانہ دیا ہے اس سے ہم کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔''

سعید اختر نعمانی نے اپنے مضمون ''چچا، ساتھی، شاعر اور رند'' میں مجاز کی بذلہ سنجی کے بارے میں لکھا ہے:

''مجاز چچا کی بذلہ سنجی ان کے حق میں زہر قاتل ثابت ہوئی، ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے کے لیے لوگ مجاز چچا کو ایک پیالہ شراب دے کر خریدتے تھے اور ان کو تمام رات گھیرے رہتے تھے، جس سے ان کی صحت گرتی ہی چلی گئی۔ موت بھی ان کی انہیں حالات میں ہوئی۔ شراب خانے میں تین بجے رات تک لوگ ان کو گھیرے رہے اور پھر چھوڑ کر چلے گئے۔ کاش ان کی طبیعت میں اتنی نرمی اور لچک نہ ہوتی۔ وہ ہر شخص کو خوش کرنے کے لیے لوگوں کے ہاتھوں اس طرح کھیلے نہ جاتے۔

گاندھی جی کی موت پر جارج برناڈ شاہ نے کہا تھا۔ ''بہت اچھا ہونا بھی خطرناک ہوتا ہے۔''

آج یہی الفاظ میں مجاز چچا کے لیے کہے بغیر نہیں رہ سکتا''

اب میں صہبا علی صاحبہ کے مضمون سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جو انہوں نے ''عموجان سے وابستہ کچھ بچکانی اور سیانی یادیں'' کے عنوان کے تحت لکھا ہے۔

''میری یادوں میں سب سے واضح یاد اُن کی زندگی کے آخری تین دنوں کی ہے۔ یعنی ۳ دسمبر ۱۹۵۵ء کی ۳، ۴ اور ۵ دسمبر کو لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال میں ترقی پسند اُردو شعرا اور ادیبوں کا ایک جلسہ ہوا تھا۔ جس میں پورے ملک کے شعراو ادیب اپنے خرچ سے آئے تھے۔ ان میں سے کچھ ۲ دسمبر کو ہی آ گئے تھے اور عموجان سے ملنے ان کی رہائش گاہ ''دارالسراج'' لکھنؤ آئے تھے۔ دو سال قبل ہی یعنی ۱۹۵۳ء میں عموجان کی چھوٹی بہن صفیہ اختر (منجھلی پھوپھی) کا صرف ۳۷ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا۔ یہ لوگ ان کی تعزیت میں عموجان کے پاس آئے تھے۔ اس دن کسی کو کیا خبر تھی کہ تین دن کے بعد وہ لوگ اسی گھر میں انہیں کی تعزیت میں ان کے ضعیف والدین کے پاس آئیں گے۔ یہ زندگی کی بے ثباتی کی ایک عبرتناک مثال ہے۔''

۴ دسمبر کی شب قیصر باغ کی بارہ دری میں مشاعرہ تھا۔ جس میں عموجان نے آخری دفعہ اپنے کلام سے سامعین کو مسحور کیا تھا۔ اس شب ان کے کلام کے کچھ اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
بایں سیل و غم و سیلِ حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

اور

زندگی ساز دے رہی ہے مجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے مجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے مجھے

یہ دو اشعار موت کے لیے ان کی اپنی پیشن گوئی ثابت ہوئے۔

قبرستان میں دفنائے جانے کے بعد مجاز کی لحد پر ان کا یہ شعر لکھا گیا تھا۔

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجاز
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

میں سمجھتا ہوں کہ صہبا علی صاحبہ نے ''مجاز کی باتیں'' کے عنوان سے جو کتاب مرتب کی ہے وہ نہ صرف ایک بہت اچھا تخلیقی کام ہے بلکہ اُردو ادب میں مجاز کے فن اور شخصیت پر اتنا بڑا کام ہے جو اسرار الحق مجاز پر ریسرچ کرنے والوں کے لیے بہت بڑا Reference Material بھی ہے۔

میں یہاں یہ بھی درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ غالب انسٹی ٹیوٹ معین احسن جذبی پر بھی ایک ایسا ہی سمینار کرے۔ میں ہریانہ اُردو اکادمی کا اشتراک پیش کرنے کو حاضر ہوں۔

علی احمد فاطمی

مجاز کی شاعری کا ابتدائی دور

اسرارالحق آگرے میں شہید تھے علی گڑھ میں مجاز ہو گئے۔

اسرارالحق کو بطور شاعر مجاز کے تخلص سے ساری اردو دنیا جانتی ہے لیکن کم لوگ جانتے ہیں کہ مجاز جب تک آگرے میں تھے مجاز نہ تھے بلکہ شہید تخلص رکھتے تھے۔ ان کے بیحد قریبی دوست و شاعر جذبی کا تخلص ملال تھا۔

کئی سال قبل میں نے مجاز کے حوالے سے ایک مقالہ لکھا تھا۔ ''مجاز کی زندگی کا اہم موڑ''..... جس میں میں نے آگرہ کے قیام کے دو سال کو مجاز کی شعری اور فکری دنیا میں ایک اہم موڑ کہا تھا اور اس میں شک نہیں کہ آگرہ میں فانی اور میکش کی صحبت و سرپرستی میں جس طرح شاعری اور خاص طور پر غزل گوئی کی نزاکتوں، اشاروں کنایوں اور قواعد کو سمجھا تھا فکر و فلسفہ کے عناصر بھی ان کے قریب آئے تھے وہ اس سے قبل نہ تھے۔ کئی غزلوں اور اشعار پر فانی سے اصلاح لی لیکن ایک دن فانی نے مجاز سے کہہ دیا ''تمہاری غزلوں میں نشاط کا رنگ ہے میرا غم تمہاری جوانی اور نشاط کو روند ڈالے گا اس لیے آئندہ مجھ سے اصلاح

نہ لیا کرو۔"

مجاز جو اس وقت شہید تھے۔ فانی سے اصلاح ضرور لی لیکن اثر نہیں۔ صحبت ضرور اختیار کی فطرت نہیں، اس لیے کہ مجاز اپنے آپ میں ایک الگ قسم کے شاعر تھے اسی لیے احتشام حسین نے ایک جگہ کہا.... "فانی سے ان کا تعلق ذہنی نہیں قنی رہا"۔

دو سال کے قیام کے بعد جب وہ آگے کی تعلیم کے لیے آگرے سے علی گڑھ پہنچے تو وہ شہید سے مجاز ہو چکے تھے۔ غزل کا شاعر نظمیں کہنے لگا۔ شباب انقلاب میں ڈھلنے لگا۔ غنائیت، اشتراکیت کے قریب پہنچنے لگی۔ لیکن یہ سب یونہی تو نہیں ہوا۔ بس اختصار سے اس موڑ اور ماحول کو سمجھنا ہے اور اسی دور کی چند نظموں پر گفتگو کے ذریعہ مجاز کی اصل حقیقت تک پہنچنا ہے۔

سب جانتے ہیں کہ مجاز نے کم عمر پائی۔ اس سے زیادہ کم عمر ان کی شاعری کی ہے۔ بقول آل احمد سرور "ان کا مجموعہ کلام بہت مختصر ہے۔ ان کی بہترین نظمیں ۱۹۳۵ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان کی ہیں"

ان بہترین نظموں کا آغاز علی گڑھ سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ ۳۵ء کے بجائے ۳۲ء...۳۳ء سے شروع ہوتا ہے۔ علی گڑھ سے تعارف کے طور پر آل احمد سرور ایک واقعہ یوں لکھتے ہیں:

> "دسمبر ۳۲ء میں انجمن حدیقۃ الشعرا کا سالانہ مشاعرہ ہوا تھا جس کی صدارت سر راس مسعود وائس چانسلر نے کی تھی اور جس میں مولانا حسرت اصغر گونڈوی اور حفیظ جالندھری شریک ہوئے تھے۔ طلبا کے لیے اس میں نظم کا عنوان صبح بہار رکھا گیا تھا۔ مجاز کی نظم پر شروع میں حسب معمول ہوٹنگ ہوئی مگر بعد میں اس کی رنگینی اور دلکشی اور پڑھنے والوں کے پرسوز ترنم

نے داد بھی حاصل کی تھی۔ یہ مجاز کا علی گڑھ سے پہلا تعارف تھا۔''

قیاساً کہا جا سکتا کہ صرف علی گڑھ ہی نہیں مجاز کا نظم سے بھی پہلا تعارف ہے۔ ورنہ وہ اس سے پہلے صرف غزلیں ہی کہتے تھے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ نظمیں حسرت اور اصغر جیسے ماہرین اور شہرت یافتہ غزل کے شاعروں کے سامنے پیش کی گئیں۔ علی گڑھ میں مجاز کی پہلی دوستی جاں نثار اختر سے ہوئی۔ دونوں آل احمد سرور سے ملے۔ سرور علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر تھے لکھتے ہیں:

''جاں نثار اختر سے سب سے پہلے مجھے مجاز نے ہی ملوایا تھا۔ میری ادارت کے زمانے میں مجاز کی نظم نمائش، ایک غزل اور انقلاب نظم اسی میگزین میں چھپیں۔''

یہ زمانہ ۳۲۔۳۳ء کا ہے اور یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ تین تخلیقات میں دو نظمیں ہیں۔ غور کرنے کی بات کہ غزل کا شاعر نظم کی طرف کیسے متوجہ ہوا اور یہ نظمیں اپنے آپ میں کیا مزاج رکھتی ہیں۔ لیکن اس سے قبل علی گڑھ کے ادبی و فکری ماحول پر ایک نظر کہ اس کی تفہیم ممکن نہیں۔ اس ضمن میں ایک بار پھر آل احمد سرور کے جملے اگرچہ روا روی کے ہیں لیکن پیش کرتا چلوں کہ سرور ان سب کے چشم دید گواہ ہیں اور سب سے معتبر اور قریب تر راوی۔

''اُس زمانے میں علی گڑھ میں نئے خیالات کی رو شروع ہوئی۔ ڈاکٹر اشرف یورپ سے واپس آ گئے تھے۔ اختر حسین رائے پوری بی۔اے کرنے کے بعد آفتاب ہوسٹل میں مقیم تھے۔ وہیں سبطِ حسن بھی تھے۔ اختر رائے پوری نے اپنا مضمون ادب اور زندگی اسی زمانے میں لکھا تھا جب وہ رشید صاحب کے یہاں مقیم تھے۔ سبط حسن کے بعض ترجمے اور حیات اللہ انصاری کی

کہانیاں بھی علی گڑھ میگزین میں شائع کی تھیں۔ سجاد ظہیر آکسفورڈ میں ایک طویل عرصہ تک قیام کرنے کے بعد علی گڑھ بھی آئے تھے۔ انگارے شائع ہوتے ہی ضبط ہو چکی تھی۔ یہ باتیں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ اس دور کا اثر مجاز پر بھی ہوا اور نمائش، صبح بہار کا لکھنے والا انقلاب کا نقیب بن گیا۔''

انقلاب کے اس نقیب کو دہلی میں کئی زخم لگے کہ علی گڑھ کے بعد دہلی میں ریڈیو پر ملازمت کی اور ایک سال کے بعد ملازمت سے برطرف کر دیے گئے۔ آوارہ ہوئے، اور دربدری بھی..... باوجود اس کے کہ وہ کمزور دل کے تھے لیکن ان کے مزاج میں بقول فیض افسردگی نہیں تھی بلکہ سرخوشی اور سرمستی تھی۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ جب دہلی چھوڑ کر وہ لکھنؤ آئے تو ان کی صحبتیں جوش، سجاد ظہیر، سردار جعفری، عبدالعلیم، احتشام حسین وغیرہ سے رہیں۔ نیا ادب رسالہ سے وابستہ ہوئے۔ ادب کا سنجیدہ اور سماجی مقصد سامنے آیا۔ لکھنؤ سے ہندستان اخبار نکلتا تھا۔ اسی زمانہ میں اور اسی رسالہ میں اندھیری رات کا مسافر اور سرمایہ داری جیسی نظمیں شائع ہوئیں۔ ساقی کے سالنامہ میں آوارہ شائع ہوئی۔ ان نظموں پر گفتگو کرنے سے قبل علی گڑھ اور لکھنؤ کے اس ماحول کے بارے میں دو اقتباسات ملاحظہ کرتے چلیے۔ علی گڑھ کے بارے میں منظر سلیم لکھتے ہیں:

''علی گڑھ کے ماحول نے جس میں حسن و نغمہ، ساز و جام اور تیغ و سناں کی بڑی خوبصورت سی آمیزش پائی جاتی تھی مجاز کے شعری مزاج نے ذہنی رویہ اور فکری پرواز کی راہیں متعین کیں.... ڈاکٹر اشرف، اختر رائے پوری، آل احمد سرور، حیات اللہ انصاری، جاں نثار اختر، سبط حسن، سردار جعفری، جذبی اور ایسے دوسرے نوجوانوں سے قربت اور دوستی نے جو مارکزم سے متاثر تھے مجاز

کو اشتراکیت، انقلاب اور ترقی پسندی کے تصورات سے واقف کرایا اور یہ سب عناصر ان کی ذہنی اور فکری دنیا کی تشکیل میں معاون ثابت ہوئے۔''

سردار جعفری لکھنؤ کی زندگی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نوعمر ترقی پسندوں کی ٹولی عجیب وغریب زندگی بسر کر رہی تھی۔ کچھ تو ابھی تک کالج اور یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے لیکن سارے ہندستان میں مشہور ہو چکے تھے۔ ہمارے چار مشغلے تھے۔ تعلیم، ادب، سیاست اور آوارہ گردی۔ اس اعتبار سے ہم مختلف اوقات میں مختلف مقامات پر پائے جاتے تھے۔ ایک سرے پر فرنگی محل تھا جس کے روشن خیال اور خوش اخلاق علما کے ساتھ نہایت ادب سے بے باک بحثیں ہوتیں۔ دوسرے سرے پر ریڈیو کی مشہور گانے والی گوہر سلطان کا وہ گھر تھا جسے ہم خرابات کہتے تھے۔ ان دونوں سروں کے درمیان پانیر ہندستان نیا ادب کے دفاتر تھے۔ نجانے کتنے کافی ہاؤس اور مے خانے تھے اور یہ ساری گذرگاہیں کوچۂ یار سے ہوتی ہوئی زندانوں کی طرف جارہی تھیں جن کی دیواروں کے پیچھے آزادی کی خوبصورت صبح کا اُجالا دھندلا نظر آرہا تھا اور اس کی دلفریبی ہماری نگاہوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔''

مجاز خواہ کتنے ہی لاابالی کیوں نہ رہے ہوں لیکن وہ شاعر تھے ایک حساس اور دردمند انسان تھے۔ اکثر ان کے دل میں درد اور آنکھوں میں نمی رہتی تھی۔ اختر شیرانی جن کی شاعری کو مجاز بہت پسند کرتے تھے۔

جب اچانک ان کی موت کی خبر سُنی تو بقول پرکاش پنڈت:

''میں محلہ کے باہر سڑک کے کنارے کھڑا سامان کی نگرانی کر رہا تھا کہ ایک دُبلا پتلا شخص بُری طرح لڑکھڑاتا میرے سامنے آکھڑا ہوا۔ ''اختر شیرانی مرگیا..... ہائے اختر شیرانی ...تو اردو کا بہت بڑا شاعر تھا۔ وہ شخص بار بار یہی جملہ دہرا رہا تھا۔ ہاتھوں میں خلاء میں الٹے سیدھے خطوط بنا رہا تھا...عین اسی وقت کہیں سے جوش نکل آئے اور مجھے پہچان کر بولے....'اسے سنبھالو پرکاش یہ مجاز ہے''۔

اور آگے بڑھ کر پرکاش پنڈت نے بڑے کام کی بات کہی ہے:

''واقعہ یہ ہے کہ اختر شیرانی اور مجاز کی شاعری کا پس منظر ایک ہے۔ بنیادی طور پر دونوں رومانی شاعر ہیں۔ وہاں بھی بیکار زندگی کی افسردگی کا نکھار ہے اور یہاں بھی وہاں بھی شراب ہے اور یہاں بھی۔ وہاں بھی کوئی نہ کوئی سلمیٰ اور عذرا ہے اور یہاں بھی کوئی زہرہ جبیں ....وہاں بھی غالب، مومن، حافظ اور خیام کا لب ولہجہ ہے اور یہاں بھی۔ لیکن آگے چل کر جو چیز مجاز کو اختر شیرانی سے الگ کرتی ہے وہ ہے مجاز کا ترقی پسندانہ رجحان، خالص عشقیہ شاعری کرتے ہوئے بھی وہ اپنی زندگی اور عام زندگی کے میلانات اور تاثرات سے پہلو تہی نہیں کرتا۔ حسن و عشق کی ایک الگ دنیا بسانے کی خواہش کے برعکس وہ حسن و عشق پر عائد کردہ پابندیوں اور ماحول کی ناآسودگیوں کے خلاف اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتا ہے....''

اختر شیرانی اور مجاز کے پس منظر، مزاج کی یکسانیت غور طلب ہے اور اس پر کسی اور مقالے میں گفتگو کی جاسکتی ہے۔ یہاں اس مجاز کی بات کرنی ہے جو غزل کی روایتی عشقیہ شاعری سے نکل کر نظم کی ترقی پسند شاعری کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ لیکن عشق کا دامن نہیں چھوڑتا بس مزاجِ عشق میں تبدیلی لے آتا ہے اسی لیے اپنے تعارف میں پہلے تو یہ کہتا ہے:

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنسِ الفت کا طلب گار ہوں میں
عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

لیکن جلد ہی وہ آگے بڑھ کر یہ بھی کہتا ہے:

خوابِ عشرت میں ہیں اربابِ خرد
اور اک شاعرِ بیدار ہوں میں
حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں
نوعِ انساں کا پرستار ہوں میں
اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں
ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

یہ اشعار اس وقت کہے گئے جب انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد نہیں پڑی تھی۔ لکھنؤ کی کانفرنس اور پریم چند کا خطبہ منظر عام پر نہیں آئے تھے لیکن ملک و معاشرہ کے حالات بہت کچھ بدل چکے تھے۔ مجاز نے جس وقت علی گڑھ کے دانشورانہ ماحول میں قدم رکھا۔ وہ صرف علی گڑھ کا ہی نہیں بلکہ پورے ہندستان کا تاریخی دور تھا۔ پورے ملک بلکہ پورا ایشیا ذہنی کرب اور بیداری کے ایک نئے دور سے گذر رہا تھا۔ پرانے فرسودہ نظام کی جگہ

نیا نظام اور نیا سماج اپنا لباس بدلنے کے لیے انگڑائیاں لے رہا تھا۔ تحریک آزادی اور تفکیر حُریت نے بال و پر کھول رکھے تھے۔ ملک میں سوشلزم کے نعرے بلند ہونے لگے تھے اور جس کی گونج ایوانِ کانگریس میں بھی سنائی پڑنے لگی تھی۔ بقول سردار جعفری:

> ''یہ ۱۹۳۳ء کا زمانہ تھا اور ہندستان کے نوجوانوں میں ایک عام سی بے چینی کی لہر دوڑ رہی تھی اور فضا میں سوشلزم کے نعرے بلند ہو رہے تھے جو کانگریس کے ایوان تک پہنچ گئے تھے اور ۱۹۳۶ء میں کانگریس کا اجلاس لکھنؤ کے صدارتی خطبے میں پنڈت نہرو کی زبان سے ادا ہوئے۔''

دوسری طرف اس سال (۱۹۳۶) ترقی پسند انجمن کی پہلی کانفرنس میں پریم چند اپنے صدارتی خطبہ میں گاندھی واد سے باہر آکر سماج واد کا اعلان کر رہے تھے۔ غرضکہ سیاسی، سماجی، ادبی ہر اعتبار سے یہ دور غیر معمولی تبدیلی کا دور تھا۔ زندگی کا ہر پہلو متاثر ہو رہا تھا لیکن اس اثر انگیزی میں صرف نہرو، پریم چند کا ہی دخل نہ تھا بلکہ حالی، اقبال کا جذبۂ حب الوطنی، اختر شیرانی، حسرت وغیرہ کا رومانی حقیقی انداز۔ جوش کا انقلابی لب و لہجہ۔ کچھ افسانے۔ ترجمے غرضکہ ان سب کے ذریعہ بدلتے ہوئے حالات نے مجاز کے ذہن پر ایک اچھا اثر ڈالا اور بقول آل احمد سرور.... ''نمائش اور صبح بہار لکھنے والا انقلاب کا نقیب بن گیا۔''

احتشام حسین نے بھی لکھا ہے:

> ''۱۹۳۰ء سے بعد کی سیاسی تگ و دو نے تو اسے (مجاز) خاص طور پر متاثر کیا تھا چنانچہ مجاز کے شعور کو وہاں پہنچ کر نئی غذا ملی اور احساس کی منزلیں جلد جلد طے ہونے لگیں۔''

لیکن احتشام حسین نے ایک اور نازک بات کہا ہے:

> ''عمر کی وہ منزل تھی جس کے لیے شاد عظیم آبادی نے ''اُف ری

جوانی ہائے زمانے'' کے بولتے ہوئے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

یہاں جذبات اور تجربات کا تجزیہ آسان نہیں رہ جاتا۔''

اس لیے مجاز کی سماجی اور انقلابی شاعری کا تجزیہ بھی آسان نہیں جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔ تاہم یہ بات تو اپنی جگہ اہم ہے کہ مجاز انجمن کے حوالے سے ترقی پسند شاعری کی پہلی کمیٹڈ آواز تھے۔ جو اپنے خاص مجازی رنگ و آہنگ کے ساتھ نمودار ہوئے۔ نمائش اور صبح بہار ہزار براہ راست انقلابی نوعیت کی نظمیں نہ ہوں لیکن روایتی غزلوں سے منھ موڑ کر نظمیں کہنے اور پھر انقلاب تک پہنچنے کا اپنا ایک فکری اور تخلیقی سفر تو تھا ہی اور پھر وہ جلد ہی انقلاب جیسی نظم کہتے ہیں۔ رات اور ریل، نذر علی گڑھ، نذر خالدہ، اندھیری رات کا مسافر، سرمایہ داری سے لے کر آوارہ تک سفر طے ہوتا ہے اور اپنی ہر نظم میں ایک رومانی لیکن گہرے سماجی شعور اور انقلابی ذہن کا پتہ دیتے ہیں۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں ترکی شاعرہ خالدہ ادیب خانم کی آمد پر جو استقبالیہ نظم نذر خالدہ (۱۹۳۳ء) کہی وہ محض استقبالیہ نظم نہیں بلکہ آگے کی بھی چیز ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

غنچہ و گل تھے یہی لیکن یہ رعنائی نہ تھی
اس گلستاں میں بہار اس دھوم سے آئی نہ تھی
خالدہ تو ہے بہشتِ تر کمانی کی بہار
تیری پیشانی پہ نور حُریت آئینہ کار
تو نے ترکوں کو دکھائی ہے صراطِ مستقیم
پھونک ڈالے ہیں تعصب کے حجاباتِ قدیم
ضعف دکھلایا ہے جب بھی فطرت احرار نے
آگ برسادی ہے تیرے نطقِ گوہر بار نے

ان اشعار کو بغور ملاحظہ کیجیے کیا محض استقبالیہ مزاج کے ہیں۔ کیا ان میں صرف

استقبال ہے۔ اظہارِ اخلاق ہے؟ نہیں اس میں اور بھی بہت کچھ ہے۔ اگر ایک طرف ایسے حسرتناک مصرعے ہیں:

آہ یہ جوہر ہماری دسترس سے دور ہیں

تو دوسری طرف ارادہ اور نظریہ بھی:

کوئی دم میں اس گلستاں سے نکلنا ہے ہمیں
فرشِ گل سے دور انگاروں پہ چلنا ہے ہمیں
خار زارِ غم کو پیروں سے کچلنا ہے ہمیں
جادۂ منزل میں گرنا ہے سنبھلنا ہے ہمیں

یہی نہیں بعض مصرعے ایسے ڈھلے ہوئے ہیں جو دماغ سے نہیں دل سے نکلے ہیں کہ مجاز کی شاعری میں دماغ سے زیادہ دل ہی دھڑکتا ہے۔ اگر ایک طرف یہ نظم محض استقبالیہ نہ ہو کر نظریاتی تخلیق کا خوبصورت اظہاریہ بن گئی ہے تو دوسری طرف مجاز کی غزلیہ شاعری کے روایتی لب ولہجہ سے نکل کر ایک نئے لفظیاتی اور استعاراتی نظام میں بھی ڈھل رہی ہے جہاں جذبۂ عشق تو ہے لیکن تصورِ عشق ذاتی کم کائناتی زیادہ ہے۔ باطنی کم خارجی زیادہ ہے لیکن یہ خارج باطن کے تار کو کچھ اس طرح سے چھیڑ رہا ہے کہ شاعری کا رنگ و آہنگ بھی برقرار ہے اور انسانی ذہن کا اضطراب اور پیچ وتاب بھی۔ یہ سب آپس میں اتنی فنکاری کے ساتھ شیر وشکر ہو گئے ہیں کہ کہیں کہیں نظم غزلیہ انداز میں اُتر کر ایسے اشعار بھی دے گئی:

قربتِ گل کس قدر جاں بخش ہے خاروں سے پوچھ
چاند کی تنویر میں کیا لطف ہے تاروں سے پوچھ
نشہ صہبا میں کیا لذت ہے میخواروں سے پوچھ
چارہ سازی میں مزہ کیا ہے یہ بیماروں سے پوچھ

نظم اس موڑ پر ہے خواری اور چاری سازی دونوں کو گلے لگائے ایک پر کیف امتزاجی آہنگ کے ساتھ اس طرح کے معنی خیز پیغام بھی دے جاتی ہے:

درس ایسا دے کہ دل آزادۂ منزل نہ ہو
فکر لا حاصل نہ ہو اندیشۂ باطل نہ ہو

ملاحظہ کیجیے اس کا اختتامی تاثر جو محض استقبال تک محدود نہیں رہا بلکہ اور آگے بڑھ کر اضطراب و احرار کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ اپنے پورے تخلیق جوہر کے ساتھ نظم کی یک موضوعی ابتدا رفتہ رفتہ کئی پہلوؤں کو چھوتی ہوئی اپنے دائرے کو بڑا کرتی ہوئی آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے۔

یہ نظم تو پھر بھی ایک غیر معمولی انقلابی شخصیت کی شان میں لکھی گئی ہے جہاں انقلاب اور احتجاج کے عناصر کا آ جانا فطری ہے لیکن ان کی اگلی نظم رات اور ریل (۱۹۳۳)۔ جہاں صرف ریل کا سفر ہے۔ رات کا منظر ہے۔ اس کی رفتار ہے... لیکن شاعر نے رات اور ریل دونوں کی کیفیت اور رفتار کو جس طرح مُدغم کر کے پہلے اس کی رفتار کی جہتوں کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے:

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیر لب گاتی ہوئی
ٹھوکریں کھا کر لچکتی، گنگناتی جھومتی
سرخوشی میں گھنگھروؤں کی تال پر گاتی ہوئی

پھر اس کے بعد رات کے حوالے سے:

رات کی تاریکیوں میں جھلملاتی کانپتی
پٹریوں پر دور تک سیماب چھلکاتی ہوئی
جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات

شادیانوں کی صدا سے وجد میں آتی ہوئی

پھران دونوں کے امتزاج سے ایسے اشعار بھی خلق ہوتے ہیں:

اک بگولے کی طرح بڑھتی ہوئی میدان میں
جنگلوں میں آندھیوں کا زور دکھلاتی ہوئی
جستجو میں منزلِ مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دُھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی

اور پھر ریل کے حوالے سے شاعر اپنی تخلیق وتفکیر کی اس منزل پر آتا ہے:

صفحہ ہستی سے مٹاتی عہدِ ماضی کے نقوش
حال و مستقبل کے دل کش خواب دکھلاتی ہوئی
دامنِ تاریکئ شب کی اُڑاتی دھجیاں
قصر ظلمت پر مسلسل تیر برساتی ہوئی
ایک اک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار
عظمت انسانیت کے زمزمے گاتی ہوئی
وہ ہوا میں سینکڑوں جنگی دُہل بجتے ہوئے
وہ بگل کی جانفزا آواز لہراتی ہوئی

اور آخری شعر:

الغرض اڑتی چلی جاتی ہے بے خوف وخطر
شاعرِ آتش نفس کا خون کھولاتی ہوئی

ریل کا سفر میں ریل کی رفتار کو زندگی کی رفتار سے وابستہ کرنا۔ حال، ماضی، مستقبل سے رشتے استوار کرنا۔ رات کی تاریکی کو غلامی سے تعبیر کرنا اور پھر قصر ظلمت تیر برسانا۔ جنگی دہل جانفزا آواز اور آخر میں شاعر آتش نفس کا خون کھولنا..... یہ سب محض ریل کے نظارے نہیں بلکہ فکروخیال اور جمال وجلال کے وہ استعارے ہیں جہاں شاعر

گوشت پوست کے محبوب کے لمحاتی لذتِ وصل سے بہت آگے بڑھ کر زندگی کی حرکت و حرارت سے اپنے آپ کو جوڑ دیتا ہے۔ ہر چند کہ مجاز کی اس نوع کی شاعری میں جوش اور اختر کے اثر اور آثار نظر آتے ہیں کہ منظریہ شاعری میں نظریہ کی حلاوت اور پھر اضطراری اور مزاحمتی کیفیت سے دوچار کرتے ہوئے منظر کے بطن سے معنی خیز اور فکر انگیز سوال کھڑا کر دینا ان اساتذہ کا کمال رہا ہے اور مجاز کے ساتھ دوسرے ترقی پسند شعرا نے اس سے فیض اٹھایا ہے۔ یہ کوئی ایسی غلط بات نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ مجاز نے اسے کس طرح برتا اور کس نوع کے فکر و فن سے دوچار کیا ہے۔

مجاز کی یہ دونوں نظمیں بیحد مشہور ہوئیں اور ایک نئے مجاز کو پیش کر گئیں۔ یہ وہ دور تھا جب وہ علی گڑھ میں تھے اور ان کی شراب نوشی اور عشق بازی اپنی حدوں میں تھی اور رومانیت کو زندگی کی حرارت اور حقیقت اور فکر و نظر کی تمازت مل رہی تھی۔ چاروں طرف علمی و ادبی اور نظریاتی گفتگو اور مباحث کا بول بالا تھا۔ حتیٰ کہ علی گڑھ میگزین جس کی اپنی حدیں ہوا کرتی تھیں اس میں باغیانہ قسم کی کہانیاں، مضامین اور ترجمے شائع ہو رہے تھے۔ اس کا اثر مجاز کے دل و دماغ پر کچھ اس انداز سے ہوا کہ طرب کی کوئی بھی تان ان کے وجدان پر ضربیں لگا رہی تھی اور وہ مطرب کو مخاطب کر کے انقلاب جیسی نظم کہہ گئے:

چھوڑ دے مطرب بس اب للہ پیچھا چھوڑ دے
کام کا یہ وقت ہے کچھ کام کرنے دے مجھے
تیری تانوں میں ہے ظالم کس قیامت کا اثر
بجلیاں سی گر رہی ہیں خرمنِ ادارک پر
یہ خیال آتا ہے وہ رہ کر دلِ بیتاب میں
بہہ نہ جاؤں پھر ترے نغمات کے سیلاب میں
چھوڑ کر آیا ہوں کس مشکل سے میں جام و سبو
آہ کس دل سے کہا ہے میں نے خونِ آرزو

مجاز اپنی بعض کمزوریوں کو محسوس کرتے ہوئے نظم کی ابتدا ان اشعار سے کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی موسیقیت اور مرتبت کا اعتراف بھی کرتے ہیں:

تیرے ہی نغمے سے وابستہ نشاطِ زندگی
تیرے ہی نغمے سے کیف و انبساطِ زندگی
مجھ کو تیرے سحرِ موسیقی سے کب انکار ہے
مجھ کو تیرے لحنِ داؤدی سے کب انکار ہے

لیکن مجاز عصری تقاضوں کو مطالبۂ وقت کو بھی محسوس کر رہے تھے اور وہ یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ اگر چاروں طرف شور برپا ہو تو سرگوشیوں کے کوئی معنی نہیں ہوا کرتے ہیں اسی طرح شورِ انقلاب ہے تو اچھی سے اچھی موسیقی بھی کانوں کو بُری لگتی ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں:

بزمِ ہستی کا مگر کیا رنگ ہے یہ بھی تو دیکھ
ہر زباں پر اب صدائے جنگ ہے یہ بھی تو دیکھ
فرشِ گیتی سے سکوں اب مائلِ پرواز ہے
ابر کے پردوں میں ساز جنگ کی آواز ہے

--

پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب

اسی کے بعد نظم شورِ انقلاب کی طرف بڑھ جاتی ہے اور کئی اشعار میں حالات حاضرہ کے چرچے ہیں اور نظم نسبتاً راست اور سپاٹ ہو جاتی ہے۔ مثلاً اس طرح کے شعر:

ختم ہو جائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوشِ انتقام

جو لوگ مجاز کی شخصیت اور حیات سے واقف ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کی

رومانی اور بے نیاز شخصیت اور ان کا فطری ذہنی بکھراؤ زندگی کے دو ایک موڑ پر ہی سمٹ سکا ہے اور وہ سنجیدہ و معیاری شاعری کر سکے ہیں اور اصل ترقی پسند مجاز نکل کر سامنے آیا ہے۔ پہلا موڑ علی گڑھ کے یہ چند برس ہیں جہاں انہوں نے ایسی غیر معمولی نظمیں کہی ہیں جسے میں پہلی ترقی پسند شاعری کی پہلی منزل کہہ سکتا ہوں۔ بقول لُدمیلا واسی لیوا۔ ''فیض کے ہمعصر اسرارالحق مجاز کے اشعار میں جو بحیثیت شاعر اپنی چند روزہ شہرت کے درج کمال پر فیض سے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔'' پہلی باران کی اشتراکی فکر اور ترقی پسند ذہنیت کا اظہار ہوتا ہے۔ یوں تو انقلاب کا لفظ سیاسی تصور کے ساتھ اقبال اور جوش کی شاعری میں استعمال ہو چکا تھا۔ اس نظم کے درمیانی ٹکڑوں میں جوش کی سی گھن گرج ہے جہاں مجاز پیچھے ہو گئے ہیں لیکن مجاز اس نوع کی شاعری کے ساتھ دیر تک نہیں چل پاتے اور رومانیت، غنائیت اور غزلیہ مزاج ان کو زیادہ دیر تک بھٹکنے نہیں دیتا۔ انقلاب کے موضوع، شور غل اور گھن گرج کے درمیان وہ اپنے اصلی رنگ میں نظر آتے ہیں اور اس طرح اشعار کہتے ہیں:

خون کی رنگینیوں میں ڈوب جائے گی بہار
ریگ صحرا پر نظر آئیں گے لاکھوں لالہ زار
خون سے رنگیں فضائے بوستاں ہو جائے گی
نرگسِ مخمور چشم خوں فشاں ہو جائے گی

اور پھر ملی جلی کیفیت میں نظم اس شعر پر ختم ہوتی ہے:

اور اس رنگِ شفق میں باہزاروں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حُریت کا آفتاب

یہاں یہ بات پھر سے دہرانے کی ہے کہ یہ نظم ۱۹۳۳ء کی ہے اس وقت سجاد ظہیر وطن نہیں لوٹے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام بھی عمل میں نہ آیا تھا اور نہ ہی اس کا منشور منظرِ عام پر آیا تھا۔ یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ مجاز نے اشتراکیت کا مطالعہ کس قدر کیا

تھا۔آل احمد سرور نے لکھا ہے:

''مجاز کو نہ تو علم و فضل میں کوئی کمال حاصل رہا نہ انہوں نے کسی بڑی تحریک سے دلچسپی لی۔ ذہنی طور پر وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے مگر اس قید میں انہوں نے خاصی آزادی روا رکھی۔''

یہ سچ ہے کہ مجاز، فیض و سردار کی طرح مفکر و دانشور نہ تھے اور نہ ہی ان کی طرح مارکسی اور انقلابی، جس کے سلسلے جوش سے لے کر مخدوم تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے علی گڑھ کے اس ترقی پسند ماحول میں انقلاب جیسی نظم کہہ تو جاتے ہیں لیکن فطری طور پر آگے کی نظمیں رومان پرور اور جذبات انگیز مزاحمت میں بدل جاتی ہیں۔ انقلاب کے بعد وہ نورا اور ننھی پجارن جیسی نظمیں کہتے ہیں۔ علی گڑھ اور دلی پر نظمیں کہتے ہیں۔ ذاتی زندگی میں کئی طرح کے غمناک واقعات رونما ہوتے ہیں لیکن یہ دوستِ غم مجاز کی شاعری میں تعمیری رول ادا کرتی ہے۔ جس نے ان کی تخلیقیت میں توازن ہی پیدا کیا اور وہ اندھیری رات کا مسافر جیسی نظم کہتے ہیں۔ اس زمانے میں اگر ایک طرف ان کے سامنے دہلی کے حادثات تھے تو لکھنؤ کے احباب بھی نیا ادب اور نئی شاعری کا پیغام دے رہے تھے۔ اسی لیے ان کی اس نظم اور بعد کی بیشتر نظموں میں امید و نشاط کی کیفیت ہے تو دوسری طرف ایک متاثر کن یاسیت اور فسوں ساز قنوطیت کہ جس نے نظم کے اثر کو کئی جہتوں میں لا کر اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ نظم شروع ہوتی ہے:

جوانی کی اندھیری رات ہے ظلمت کا طوفاں ہے
مری راہوں میں نورِ ماہ و انجم تک گرمزاں ہے
خدا سویا ہوا ہے اہرمن محشر بداماں ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

نظم کے کئی بندوں میں غم و حرماں، کافر بلائیں، چیں بر جبیں، بسمل، اندھیرا سب

کچھ ہے۔ غزل کی لفظیات ہے۔ کلاسیکی بہاؤ ہے۔ ایک بند تو ایسے صوفیانہ آہنگ میں ڈوب جاتا ہے۔

چراغِ دیر فانوسِ حرم قندیل رہبانی
یہ سب ہیں مدتوں سے بے نیاز نورِ عرفانی
نہ ناقوسِ برہمن ہے نہ آہنگِ ہدی خوانی
مگر میں اپنی منزل کی طرف .....

اس نظم میں بھی اقبال اور جوش کی جھلکیاں نظر آتی ہیں..... لیکن مجاز کا اپنا یہ مصرعہ ہے جو پوری نظم پر حاوی ہے..... ''مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں'' منزل، قدم حوصلہ۔ یہ اقبال اور جوش کے بعد کے رویے اور نظریے ہیں جو مجاز کے اپنے ہیں لیکن یہ وہی ترقی پسند نظریات ہیں جو اس عہد میں کیا علی گڑھ..... کیا لکھنؤ اور کیا دہلی.... ہر جگہ اپنی اپنی آواز بلند کر رہے تھے لیکن ان آوازوں میں مجاز کی آواز سب سے الگ تھی۔ ایک تو یہ پہلی آواز تھی دوسرے یہ پورے طور پر اشتراکی نہ تھی اور نہ ہی نظریاتی بلکہ وجدان کے بطن سے پھوٹتی ہوئی جذباتی آواز تھی کہ مجاز بقول سرور:

''اپنے جذبہ کو ہی اس نے اپنا رہبر جانا تھا.....''

میں اس مقالہ میں آوارہ پر کوئی گفتگو نہیں کر رہا ہوں۔ یہ مجاز کی ہی نہیں اردو کی چند شاہکار نظموں میں سے ایک ہے اور ایک الگ اور مفصل مضمون کا تقاضا رکھتی ہے۔ لیکن اس عہد کی بعض دیگر نظموں کا ذکر ضرور کروں گا۔ مثلاً... آج کی رات، ایک دوست کی خوش مذاقی پر شوقِ گریزاں، نغمۂ ٹیگور، خانہ بدوش، مجبوریاں وغیرہ۔ یہ ساری نظمیں ۳۶ء سے قبل کی ہیں۔ جن کا براہ راست تعلق اشتراکیت یا انقلابیت سے نہیں ہے لیکن ان غیر انقلابی نظموں کا لہجہ۔ مصرعہ ملاحظہ کیجیے تو مجاز کی اصل حقیقت جھانکتی نظر آئے گی۔

حسن فطرت کی لطافت کا جو تو قائل نہیں

میں یہ کہتا ہوں تجھے جینے کا حق حاصل نہیں

(ایک دوست کی خوش مذاقی پر)

پھوٹ نکلا در و دیوار سے سیلابِ نشاط
اللہ اللہ مرا کیفِ نظر آج کی رات
شبستانِ تجلّی کا فسوں کیا کہیے!
چاند نے پھینک دیا رختِ سفر آج کی رات

(آج کی رات)

ماہ و انجم سے مجھ کو کیا نسبت
مجھ کو ان کا مزاج داں نہ بنا
جس کو اپنی خبر نہیں رہتی
اس کو سالارِ کارواں نہ بنا

(شوق گریزاں)

اٹھے ہیں جس کی گود سے آذر وہ قوم ہے
توڑے ہیں جس نے چرخ سے اختر وہ قوم ہے
پلٹے ہیں جس نے دہر کے دفتر وہ قوم ہے
پیدا کیے ہیں جس نے پیمبر وہ قوم ہے
اب کیوں شریک حلقہ نوعِ بشر نہیں
انسان ہی تو ہیں یہ کوئی بشر نہیں

(خانہ بدوش)

قسم شوق کی فطرتِ مضطرب

یونہی نت نئی دُھن میں گائے چلا جا
جو پرچم اچھا ہی لیا سرکشی کا
اسے آسماں تک اڑاتے چلا جا

(مسافر)

مجاز کی پریشانی اور بے چینی ذاتی ہے اور سماجی بھی..... کبھی وہ فطرت سے اُلجھ رہے ہیں کبھی محبت سے ایک عجیب سے نامکمل پن ہے ان کی ذات میں اور زندگی میں بھی۔ جوانہیں پریشان کیے رہتا ہے کہ علم وفکر سے زیادہ ایک شاعر کے لیے دنیا کے نامکمل اور نابرابر ہونے کا احساس ضروری ہے۔ شاعری میں احساس اور وجدان کا جو رشتہ ہوا کرتا ہے وہ ایمان اور ایقان کو بنیاد میں رکھتا ہے لیکن پس منظر میں بھی رکھتا ہے۔ مجاز کی شاعری کا بنیادی وصف یہی ہے کہ اس نے سادہ اور سامنے کے موضوعات میں بھی اپنے جذبہ اور وجدان کو اپنے سے الگ نہیں کیا اور اسے اپنے تخلیقی تجربہ کا حصہ بنایا اور اپنے مخصوص شاعرانہ آہنگ سے اسے پیش کیا۔ اس کے پیچھے اس کا اپنا مخصوص ذہن تو کام کر ہی رہا ہے لیکن اس ذہن کے پیچھے ان کا اپنا تہذیبی پس منظر، شاعری کا کلاسیکی مطالعہ، ذہنی تربیت بھی کام کر رہی ہے۔ مجاز کے ساتھ تو ایک کمی یا خوبی یہ بھی تھی وہ مفکر اور دانشور نہ تھے اور نہ ہی کتابی علم پر زیادہ یقین رکھتے تھے۔ یہ سب کہ سب مجاز کے حق میں نہ گئے ہوں لیکن ان کی شاعری کے حق میں ضرور چلے گئے۔ ان کمیوں نے فکر کو خارج اور شاعری کو سخت ہونے سے بچالیا۔ اسی لیے ان کے الفاظ میں ایک نرمی اور لطافت ہے۔ نشاط ہے۔ اچھی بات ہے کہ وہ اس نشاط کو محض اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتے ہیں بلکہ پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ بقول سردار جعفری:

''مجاز کی شاعری میں شروع سے آخر تک نشاط ہی نشاط ہے۔ وہ خود اس نشاط میں ڈوب جانا چاہتا ہے اور اپنے ساتھ ساری

دنیا کو غرق کر کے مدہوش کر دینے کی فکر میں ہے۔اس کے
یہاں غم بھی شعر کا جامہ پہن کر ایک نشاط اور کیفیت پیدا
کرتا ہے۔''

اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ مجاز کی انقلابی شاعری.... اس کی رومانی اور نشاطیہ شاعری کا ایک حصہ ہے۔ اس کی توسیع اور تعبیر..... بعد میں انقلابی شاعری کی جو بھی شعریات قائم ہوئی ہو۔ پیمانے بنے ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ مجاز اس پر کھرے نہ اترتے ہوں لیکن مجاز کی انقلابی شاعری کی اپنی ایک الگ شعریات ہے تو فیض نے کہا تھا:

''مجاز کی انقلابیت تمام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے۔ عام
انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں۔ للکارتے ہیں۔
سینہ کوٹتے ہیں۔ انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے۔ ان کے ذہن
میں آمد اور انقلاب کا تصور طوفان، برق و رعد سے مرکب ہے وہ
صرف انقلاب کی ہولناکی کو دیکھتے ہیں اس کے حسن کو نہیں
پہچانتے۔''

کیا انقلاب کا بھی کوئی حسن ہوتا ہے؟ اشتراکی جمالیات اس کا جواب دیتی ہے تبھی تو پریم چند نے کہا تھا کہ بدصورتی میں بھی حُسن ہوتا ہے دیکھنے کے لیے نظر چاہیے۔ انقلاب تو پھر بھی دنیا کو حسین حسین تر دیکھنے کے لیے ہی لایا جاتا ہے۔

میں نے اس مقالہ میں مجاز کی ابتدائی دور کی شاعری کی طرف چند اشارے کیے ہیں اور میرا خیال ہے کہ مجاز کی شاعری کا یہی سب سے اہم دور ہے۔ جس کی انتہا آوارہ نظم ہے۔ اس تناظر میں ان کی بقیہ شاعری کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

آپ مجاز کو خواہ کتنا ہی لا اُبالی، شرابی اور غیر دانشور کہہ لیجیے۔ لیکن اُسے ایک مکمل شاعر اور مقبول و ہر دل عزیز شاعر تسلیم کرنے میں کسی کو تامل نہیں ہوسکتا۔ ایک حساس شخص و

شاعر کی داخلیت اور شاعری کی داخلی تخلیقیت کے سوز و ساز اور انداز بڑے انوکھے اور نرالے ہوا کرتے ہیں۔ جو شخص حسن کا پرستار ہے... رومان پرور ہے اس کے یہاں یہ داخلی کیفیت نشاط آمیز اور طرب آگیں کیفیت اور غنائیت سے تو ہمکنار ہوگی ہی اور اس سے زیادہ یہ اہم اور نازک نکتہ ہے کہ یہ سب باتیں، احساس محض اور خیال محض نہیں ہو سکتیں۔ یہ جذبہ انفرادی ہوتے ہوئے بھی عمومی اور سماجی ہو جاتا ہے۔ مجاز کے یہاں کچھ ایسا ہی ہوا۔ کچھ جوش کچھ اختر..... کچھ ماحول اور بہت کچھ مجاز کا اپنا.... سردار جعفری کے ان جملوں پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

> ''اس وقت مجاز کے محبوب شاعر جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی تھے۔ جوش کی رندی اور بے باکی، اختر کی معصومیت اور رنگینی اور حفیظ کی نغمگی نے اسے متاثر کیا تھا اور جب اس کی رندی اور بے باکی، معصومیت رنگینی اور نغمگی نے مجاز کی شاعری میں تحلیل ہو کر ایک نیا روپ اختیار کیا تو ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کی سب سے حسین شاعری پیدا ہوئی جس نے وقت کی ساری فضا کو سرشار کر دیا۔''

علی جاوید

انقلاب کا مطرب: مجاز

عالمی تناظر میں دیکھا جائے تو مجاز کا زمانہ سماجی اور سیاسی بیداری کا دور ہے۔ کارل مارکس نے ۱۸۴۸ء میں تاریخی اعتبار سے سماج کی جو تعریف کی تھی اس کی بنیاد پر دنیا کی اب تک کی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ اب تک دنیا سے تمام موجودہ سماجوں کی تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ رہی ہے۔ پہلی مرتبہ کسی نے بہت واضح طور پر سماج کو طبقات کی بنیاد پر دیکھنے اور پرکھنے کی کوشش کی تھی اور بتایا تھا کہ سماجی کشمکش کی بنیاد معاشی ہے اور تصادم دو طبقوں کے درمیان ہے۔ ایک وہ جو استحصال کر رہا ہے اور دوسرا وہ جس کا استحصال ہو رہا ہے۔

مارکس کے فلسفے کا دوسرا اہم نکتہ یہ تھا جس میں اس نے یہ کہا تھا کہ اب تک دنیا کے فلسفیوں نے مختلف طریقے سے دنیا کی تعریف کرنے کی کوشش کی ہے جو کافی نہیں۔ بنیادی نکتہ دنیا کو بدلنے کا ہے۔

اور مارکس کے اس فلسفے کو پہلی مرتبہ ۱۹۱۷ء میں لینن کی قیادت میں جب عملی شکل

حاصل ہوئی تو اس تبدیلی نے ساری دنیا میں ایک ایسا فکری انقلاب برپا کر دیا جس سے بین الاقوامی سیاست کے سارے محور متزلزل ہو گئے۔ محنت کش مزدوروں کو پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ اقتدار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی قسمت کا فیصلہ خود کر سکتے ہیں اور ذرائع پیداوار کسی کی ذاتی ملکیت نہ ہو کر اس پر مالکانہ حق عوام کا ہو سکتا ہے۔ دنیا نے پہلی عالمی جنگ کی تباہی و بربادی دیکھی تھی اور اس انقلاب نے ساری دنیا کے امن اور حریت پسند لوگوں میں امید کی ایک نئی کرن روشن کر دی اور سامراجی حکمرانوں کو ششدر کر دیا۔

اُس زمانے کے عالمی منظر نامے پر غور کریں تو دنیا کے زیادہ تر ممالک مختلف نوآبادیات (Colonies) میں بٹے ہوئے تھے اور دنیا کے عوام کی اکثریت غلام کی زندگی بسر کر رہی تھی لیکن ۱۹۱۷ء کے اس انقلاب نے امید کی جو شمع روشن کی اس نے دنیا کے مختلف حصّوں میں جمہوری تحریکوں کو نئی قوت بخشی اور ایک نئے بین القوامی سماجی اور سیاسی ماحول نے دنیا کے بڑے حصے میں جو ہلچل پیدا کی اس نے صرف سیاسی نہیں بلکہ مختلف سماجی، ثقافتی اور ادبی تحریکوں کو جنم دیا۔

ہمارے ملک کے عوام پر بھی اس کا گہرا اثر پڑا اور ابھی تک غیر منظم ادیبوں اور دانشوروں کو بھی اپنی تنظیم تشکیل دینے کی تحریک ملی جو بالآخر ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شکل میں وجود میں آئی۔ ظاہر ہے ۱۹۳۶ میں انجمن کے قیام سے پہلے بھی ادیبوں اور دانشوروں نے اس انقلاب سے جو اثر قبول کیا تھا اس کی عکاسی مختلف زبانوں کے ادب میں نمایاں طور پر نظر آنے لگی تھی۔ اردو کے ادیبوں اور شاعروں پر بھی اس کا گہرا اثر ہوا ہمارے ادیبوں کی تخلیقات میں اس کی گونج بڑے پر اثر انداز میں سنائی دینے لگی تھی۔ اس اثر کے تحت علامہ اقبال کی مشہور نظم ''خضر راہ'' وجود میں آئی جس میں انہوں نے کہا:

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

یعنی پہلی عالمی جنگ کے بعد سوویت انقلاب اور دنیا کے مختلف ممالک میں جمہوریت اور آزادی کی جدوجہد کی تحریکیں اور ان کی نظریاتی وابستگی بہت واضح طور پر سامنے آچکی تھیں۔ اس پس منظر میں ہمارے ملک میں تحریک آزادی کی نظریاتی بنادیں اور ان کی ترجیحات بہت صاف ہوچکی تھیں۔ انگریزی تسلط کے خلاف آزادی کا جذبہ اور سرمایہ داری استحصال کے خلاف ۱۸۵۷ کے انقلاب کے بعد، علامہ اقبال کے سیاسی نظریات اور ان کی شاعری عام لوگوں کے محسوسات کا حصہ بن چکی تھی۔ اس ضمن میں سجاد ظہیر اور ان کے رفقا نے ۱۹۳۲ میں ''انگارے'' کی اشاعت کر کے جو ذہنی انقلاب برپا کر دیا تھا، اس نے نوجوان ادیبوں اور دانشوروں کو اور بھی متحرک کر دیا تھا جو فطری طور پر منظم ہو کر انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل ہوئے۔ کہنے کا مقصد یہ کہ ان واضح سماجی اور سیاسی نظریاتی عوامل نے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو ایک نئی سمت عطا کی تھی جس نے آزادی کی سیاسی بنیادوں کو اور تقویت بخشی۔ ظاہر ہے مجاز کی ذہنی تربیت بھی اسی ماحول میں ہوئی تھی جو ترقی پسند تحریک میں اس طرح شامل ہوئے کہ ان کی تخلیقات نے آگے چل کر اس ادبی انجمن کے منشور جیسی شکل اختیار کر لی اور مجاز نے جو کچھ بھی کہا وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ بن گیا۔ مجاز کی شاعری کا یہی اثر تھا کہ فیض احمد فیض نے کہا: ''انقلاب کو نغمہ بنانا ہم نے مجاز سے سیکھا''۔

علامہ اقبال نے کہا تھا:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

تو مجاز نے اس خیال کو اور بھی وسعت دیتے ہوئے اعلان کیا:

عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں

خوابِ عشرت میں ہیں اربابِ خرد
اور اک شاعر بیدار ہوں میں

۱۹۳۲ کی ''انگارے'' کی اشاعت اور ملاؤں کے فتووں کی جارحیت اور شدت پسندی مجاز کے سامنے تھی، شاید انہیں باتوں کے جواب میں مجاز نے کہا تھا:

کفر و الحاد سے نفرت ہے مجھے
اور مذہب سے بھی بیزار ہوں میں

-

حور و غلماں کا یہاں ذکر نہیں
نوعِ انساں کا پرستار ہوں میں

یہ اشعار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ مجاز کا انقلابی تصور بالیدہ تھا اور محدود نہیں تھا۔ اگر ہم غور کریں تو ''انگارے'' کی اشاعت پر جو ردِ عمل مذہبی شدت پسندوں کی طرف سے آیا تھا، اس کی روشنی میں سجاد ظہیر کی وضاحت بھی یہی تھی کہ ترقی پسند تحریک مذہب مخالف تحریک نہیں بلکہ توہم پرستی اور شدت پسندی کی مخالف ہے اور انسانی بقا کے اصولوں اور مذہبی رواداری میں یقین رکھتی ہے۔ یہی وہ نظریہ ہے جو مجاز کو بے سروسامانی کے عالم میں نوعِ انساں کا پرستار بناتا ہے جو محفلِ دہر پر طاری جمود کو ایک لپکتے ہوئے شعلے اور انقلابی خیالات کی شمشیرِ بے زنہار سے ختم کرنے کا جذبہ رکھتا ہے۔

اپنے پیش رو شعرا کی طرح ان کی نظموں میں فطرت کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف شعبوں میں سائنس اور ٹکنولوجی کی ایجادات کی عکاسی اقبال اور جوش کے یہاں جو الفاظ کی جادوگری ملتی ہے، اس کی یاد دلاتی ہے۔ ''رات اور ریل'' جیسی نظم اس کی بہترین مثال ہے جسے اکثر لوگ ایک ہلکی پھلکی نظم سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں بلکہ یہ اس دور کی سائنسی اور تکنیکی ترقی کے ساتھ انسان کے ذہنی ارتقا کی بلندیوں کو بھی چھوتی ہے۔ مجاز

اس نظم کے ذریعے یہ بھی اشارہ کرتے ہیں کہ انسانی ذہن نے کس طرح کوہساروں کے دل چیر کر وادیوں کو ایک نئی زندگی عطا کی ہے جس نے زندگی کے راز کو اس طرح آشکارہ کیا ہے کہ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے:

پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیر لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
کیسے موجوں کا ترنم جیسے جل پریوں کے گیت
ایک اک لے میں ہزاروں زمزمے گاتی ہوئی

اس نظم کے مناظر کو سامنے رکھیے اور یاد کیجیے علامہ اقبال اور جوش کی منظر کشی۔

علامہ اقبال کی ''خضر راہ'' کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

شب سکوت افزا، ہوا آسودہ، دریا نرم سیر
تھی نظر حیراں کہ یہ دریا ہے یا تصویر آب
جیسے گہوارے میں سو جاتا ہے طفل شیر خوار
موج مضطر بھی کہیں گہرائیوں میں مستِ خواب
رات کے افسوں سے طائر آشیانوں میں اسیر
انجم کم ضو گرفتار طلسم ماہتاب

اس ضمن میں جوش کی نظم ''کسان'' کی طرف بھی دھیان جاتا ہے جس میں اس کے ہل کا ذکر آتا ہے۔ وہ ہل ظلمت شکن ہے اور گیتی کے دل کو چیر کر انسانی بقا کا سامان مہیا کرنے کا کارنامہ انجام دیتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے ذہنی ارتقا اور فطرت کی ہر شے کو اپنے قبضۂ اختیار میں لے لینے کی صلاحیت ہی انسانی زندگی کی بالادستی کا اور اس کی

عظمت کا ثبوت ہے جس کے پیچھے شاعر کے وہ جذبے کارفرما ہیں جو عہد ماضی کے نقوش کی روشنی میں حال اور مستقبل کے خواب دکھلاتے ہوئے ایک مفلس کو سردی کی ٹھٹھرن سے آزاد اور قصر ظلمت پر تیر برساتے ہوئے اسے سرفراز دیکھنے کی تمنا دلوں میں جگاتی ہے جو زعم میں پیشانی صحرا پر ٹھوکر مارتی ہوئی، سرکش فوج کی صورت علم کھولے ہوئے ہے اور جس کی طوفانی گرج میں، اس کی ایک ایک حرکت سے انداز بغاوت آشکار ہے، جو عظمت انسانی کے زمزے گا رہی ہے اور زندگی کے جاں فزا بگل بجاتی آگے بڑھتے چلی جا رہی ہے۔

یہ ایک بہت ہی اہم واقعہ ہے کہ مجاز کو فانی بدایونی جیسے پیش رو کی سرپرستی حاصل ہے لیکن ان سے قربت کے باوجود مجاز یاس اور مایوسی کا شکار نہیں ہوتے اور رندگی کا مقصد حرکت و عمل اور روشن مستقبل کی آرزو اور جدوجہد کے ذریعے حاصل کرنے کی بات کرتے ہیں۔ نرم و نازک لب ولہجہ اور رومانی و عاشقانہ مزاج رکھنے کے ساتھ عورت کے جس انقلابی پہلو کو مجاز نے اجاگر کیا ہے وہ مجاز سے پہلے اور ان کے بعد بھی اردو شاعری میں اتنے خوبصورت انداز میں کہیں نظر نہیں آتا:

ترے ماتھے پہ یہ انچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس انچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

اس نظم کے دوسرے اشعار کے ذریعے مجاز نے نوجوان خاتون کو مخاطب کرتے ہوئے جس بات کی آرزو کی ہے وہ بلاشبہ ترقی پسند ادبی تحریک کا مینی فسٹو ہی نہیں بلکہ عورتوں کی عظمت کا ایسا تراشیدہ استعارہ ہے جس کا کوئی متبادل کم از کم اردو شاعری میں تو نہیں ملتا۔ وہ کہتے ہیں:

تری چین جبیں خود اک سزا قانونِ فطرت میں
اسی شمشیر سے کار سزا لیتی تو اچھا تھا
یہ تیرا زرد رخ، یہ خشک لب، یہ وہم یہ وحشت

تو اپنے سر سے یہ بادل ہٹا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارہ ہے
اگر تو ساز بیداری اٹھا لیتی تو اچھا تھا
عیاں ہے دشمنوں کے خنجروں پر خون کے دھبے
انہیں تو رنگِ عارض سے ملا لیتی تو اچھا تھا
سنانیں کھینچ لی ہیں سرپھرے باغی جوانوں نے
تو سامان جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا

یہ اشعار نہ صرف یہ کہ عورتوں کی عظمت کا ایک انقلابی تصور پیش کرتے ہیں بلکہ ہمیں میکسم گورکی کے ناول ''ماں'' کی یاد دلاتے ہیں جو روسی انقلابیوں کے خوابوں کی ایک متحرک تعبیر کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

مجاز سماجی اور سیاسی سطح پر ایک نہایت بالیدہ ذہن کے مالک ہیں اور ساری دنیا کے تاریخی نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہیں۔ انہیں ساری دنیا کی تحریکوں اور ان میں خواتین کی شمولیت اور ان میں عورتوں کے رول کا علم ہے۔ اس لیے ترکی انقلابی خاتون خالدہ ادیب خانم جب علی گڑھ کے طالب علموں کے درمیان آتی ہیں تو ان کا خیر مقدم اس طرح کرتے ہیں کہ جو تیسری دنیا کے تمام حریت پسند لوگوں کی رہبر بن کر ابھرتی ہیں اور ہمارے ملک کی خواتین کو متحرک کرنے میں ایک کلیدی اہمیت کی حامل ہیں۔

جیسا کہ پہلے عرض کر رہا تھا کہ آنچل سے پرچم بنا لینے کا یہی جذبہ مجاز کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے چاہے ان کی نظم ''نورا'' ہو یا ''آوارہ''۔۔ بنت مریم نوخیز نورا کی مخمور آنکھیں مجاز کو تھپکی دیکر سلاتی نہیں بلکہ وہ آسمانی فرشتہ نظر آتی ہے جو ان میں انقلاب کی ہلچل پیدا کرتی ہے، جس کی شوخی میں سنجیدگی ہے اور جو سارے عالم کی نقاہت کو اپنے جادوئی لمس سے دور کر سکتی ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو مجاز کو شہناز لالہ رخ کے کاشانے کی سیر کرواتا ہے

اور میخانے سے ہوتا ہوا ویرانے میں لے جاتا ہے اور ایک طوفان کا منظر نامہ پیش کرتا ہے جہاں اس میں چنگیز و نادر اور سیکڑوں سلطان جابر کے ہاتھوں سے خنجر چھین کر، اس کے تاج پر دمکتے ہوئے پتھر توڑ دینے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور قصر سلطان پھونک دینے کا جوش ولولہ بیدار ہوتا ہے۔

خالدہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خالدہ تو ہے بہشت ترکمانی کی بہار
تیری پیشانی پہ نور حریت آئنہ کار
تیرے رخ سے پرتو معصوم مریم آشکار
تیرے جلووں کی صباحت سے فرشتے شرمسار
گل پشیماں قلب بلبل رشک سے دونیم ہے
تیری باتوں میں خمار کوثر و تسنیم ہے

نظم کے آخری بند پر غور کیجیے:

کوئی دم میں اس گلستاں سے نکلنا ہے ہمیں
فرش گل سے دور انگاروں پہ چلنا ہے ہمیں
خار زار غم کو پیروں سے کچلنا ہے ہمیں
جادۂ منزل میں گرنا ہے، سنبھلنا ہے ہمیں
درس ایسا دے کہ دل آزردۂ منزل نہ ہو
فکر لاحصل نہ ہو، اندیشۂ باطل نہ ہو

آخر میں ایک بار پھر کیفی کے اس قول پر غور کیجیے کہ انقلاب کو نغمہ بنانا ہم نے مجاز سے سیکھا اور ان کی نظم ''بربط شکستہ'' پر غور کیجیے۔ یہاں اس نظم کا ذکر اس لیے بھی کیا جا رہا ہے

کہ اکثر قارئین اس نظم کو یاس اور ناکامی کے جذبوں کی غماز سمجھ لیتے ہیں اور مجاز کی مایوسی پر محمول کرتے ہیں لیکن اس نظم کے ذریعے جس آرزومندی اور بقول غالب تمنا سے دوسرے قدم کی تحریک ملتی ہے وہ لافانی اور لازوال ہے:

اس نے جب کہا مجھ سے گیت اک سنا دونا
سرد ہے فضا دل کی آگ تم لگا دونا
کیا حسین تیور تھے، کیا لطیف لہجہ تھا
آرزو بھی حسرت تھی، حکم تھا، تقاضا تھا
گنگنا کے مستی میں ساز لے لیا میں نے
چھیڑ ہی دیا آخر نغمۂ وفا میں نے
یاس کا دھواں اٹھا ہر نوائے خستہ سے
آہ کی صدا نکلی بربطِ شکستہ سے

فیاض رفعت

''مجاز۔ایک مطالعہ''

اصلی فنکار انفرادیت کے پردے میں اجتماعی احساسات پیش کرتا ہے۔ سماجی روائتیں، رسم ورواج، فلسفہ و مذہب، معاشی و معاشرتی حالات اُسے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر کرتے ہیں۔ فرد اور جماعت میں جو باہمی ربط ہے اُسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اعلا فن وہی ہوگا جس میں صداقت اور حُسن دونوں ہی عناصر پائے جائیں۔ یورپ میں رومانی طرز فکر کی اساس اس نظریے کو بتایا گیا۔ اعلا فن نہ صرف اپنے دور کی حقیقتوں سے اثر قبول کرتا ہے بلکہ وہ اپنے دور کی حقیقتوں کو تبدیل کرنے میں بھی معاون ہوتا ہے۔ کلاسیکل انسان نے منطقی استدلال پر زور دیا تعقل کو اولیت دی۔ رومان پرستوں نے تمام فنون کی اساس جذبات کو بنایا۔ مادّہ پرستوں نے اشتراکی سماج کو اولیت دی۔ فکر و فن کی دنیا میں نظریوں سے مفر ممکن نہیں۔ یہ نظریات ایک دوسرے سے متصادم رہتے ہیں اور ان کے بطن سے نئی قدریں جنم لیتی ہیں۔ نئے نظریات کی تخلیق ہوتی ہے۔ حقیقت کی نئی توضیحات سامنے آتی ہیں۔ یہاں فنکار کی ذات بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی انفرادیت

فن کو زوردار اور تابناک بناتی ہے کہ توانا اور غیر فانی ادب کی تخلیق اس کے بغیر ممکن نہیں۔

مجاز کا شعری ابلاغ اور اظہار رومان اور انقلاب کا نقیب ہوتے ہوئے بھی ترقی پسند تحریک کی جکڑ بندیوں سے ہمیشہ آزاد رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر حسن و عشق کے اداشناس تھے اور دور اُن کی انقلابی شاعری بھی رومان کا زندہ و تابندہ استعارہ بن گئی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ادب لفظ اور لفظ کے ملاپ سے پیدا نہیں ہوتا۔ ادب پیدا ہوتا ہے لفظ اور زندگی کے ملاپ سے۔ اس کی روشن مثال کے لیے مجاز کا یہ اکیلا شعر بہت ہے:

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

مشہور دانشور براؤست نے کہا تھا۔ ''زندگی ہر انسان کے قلب میں ایک کتاب لکھ دیتی ہے۔ اور اُس کا پڑھنا اُس کا پہلا فریضہ ہے کہ اس کتاب کو پڑھے، لیکن اس کتاب کو پڑھنا اتنا مشکل ہے کہ لوگ قومی جنگوں میں شریک ہو کر جان تک دے دیتے ہیں کہ یہ کتاب نہ پڑھنی پڑے.... ہم اس کتاب کو پڑھنے کے لیے تیار نہیں جو زندگی نے ہمارے اندر لکھی ہے۔''

زندگی نے مجاز کے قلب پر جو کتاب لکھی تھی اُسے لفظ کے جوہر سے انہوں نے شعری بوطیقا میں ڈھال دیا:

دیکھ شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ جام ہے یہ
تو جو شمشیر اُٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

مجاز کی شعری کائنات آہنگ کے دیباچہ میں فیض نے نہایت دلپزیر بات لکھی ہے کہ ''مجاز کی شاعری، شمشیر، ساز اور جام تینوں کا مرکب ہے.... جبکہ ہمارے بیشتر شعرا نے ان اجزا میں ایک فرضی تضاد کی دیواریں کھڑی کر رکھی ہے۔ کوئی محض ساز و جام کا دلدادہ تو کوئی محض شمشیر کا دھنی۔ لیکن کامیاب شعرا کے لیے (آجکل کے زمانہ میں) شمشیر کی

سلاست اور ساز و آواز دونوں ہی ضروری ہیں"۔

بقول احتشام حسین سچ تو یہ ہے کہ کلاسیکی رویّوں اور اسالیب کو جذب کرنے کے بعد ہی مجاز ذاتی تجربات کے اظہار تک آئے۔ اُن کے موضوعات میں تصوریت اور مثالیت کے مقابلے میں ارضیت، اصلیت اور عمومیت کی فراوانی ہے۔ انہوں نے قدیم اور مروج شاعرانہ روایات اور اسالیب بیان کا احترام کرتے ہوئے اپنے سوزِ نفس سے اُن میں تازگی، جدّت و کیفیت پیدا کی۔ مجاز کے لہجہ کا دھیما پن اس کیف، گھلاوٹ و غنائیت موضوعات کی عمومیت و عصریت سے مل کر شاعرانہ پیکر اختیار کرتے ہیں۔ جس نے مجاز کی شاعری کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے وہ بغیر کسی بحث کے تسلیم کرتا ہے کہ اس میں روح عصر جلوہ گر ہے۔ اس کے تجزیوں میں بیسویں صدی کے حساس نوجوانوں کے تجربات کی جھلک ہے۔ اُن کی نظم خواب سحر کا ایک بند اس دعوے کی تائید و توثیق کرتا ہے:

ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھی رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک اُدھر دیکھا تو ہے

مجاز کے شعری سفر پر نظر ڈالیں تو ہم پر واضح ہوتا ہے کہ آگرہ کے سینٹ جانسن کالج میں جب وہ انٹر سائنس کے طالب علم تھے، انہوں نے غزل کے گیسو کے تابدار کی جنابندی کی۔ آل احمد سرور اور جذبی اُن کے ساتھی تھے۔ جذبی کا تخلص ملال تھا اور مجاز شہید ابروئے غزل تھے، فانی بدایونی نے مجاز کی ابتدا کی غزلوں پر اصلاح دی۔ یہ غزلیں کلاسیکی رچاؤ اور رمید کی مظہر تھیں۔ میکش بدایونی کی صحبت نے بھی اُن کی شاعری کو جلا بخشی۔ اُن کی ابتدائی غزل کا ایک شعر پیش خدمت ہے:

حسن کو بے حجاب ہونا تھا
شوق کو کامیاب ہونا تھا

جیسے تیسے انٹرمیڈیٹ کر کے مجاز علی گڑھ آ گئے۔ یہاں ڈاکٹر محمد اشرف نے اسٹڈی سرکل قائم کیا تھا۔ اُن کی سماجیاتی بصیرت اور جدید خیالات کی فکر انگیزی نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو دانشوری اور دلسوزی کے نئے آداب سکھلا رہی تھی۔ اُن کے ارادتمندوں میں اختر حسین رائے پوری، سبط حسین، حیات اللہ انصاری، معین احسن جذبی، جاں نثار اختر، سردار جعفری شامل ہو چکے تھے۔ مجاز بھی پورے جوش کے ساتھ اس حلقۂ یاراں میں شامل ہو گئے۔ جو وقت کی دیوار پر سرخ انقلاب کی تحریر رقم کر رہا تھا۔ ترقی پسند خیالات و افکار کی گونج مجاز کی نظموں کا حصہ ہیں ہی لیکن اُن کی کلاسیکی ذہنی تربیت انہیں ایک خاص حد سے آگے بڑھنے نہیں دیتی تھی۔ اُن کی شاعری کا بنیادی وصف غنائیت تھا۔

بقول شارب ردولوی ''آہنگ'' میں شامل اُن کی ساٹھ نظموں میں صرف اٹھارہ انیس نظمیں ایسی ہیں جن کا آہنگ سیاسی یا انقلابی ہے۔ اور ان میں بھی محض آٹھ نظمیں ''انقلاب'' (۱۹۳۳) ''سرمایہ داری'' (۱۹۳۷) ''ہمارا جھنڈا'' (۱۹۳۷) ''مزدوروں کا گیت'' (۱۹۳۸) ''آہنگ نو'' (۱۹۴۲)، ''بول اری او دھرتی بول'' (۱۹۴۵) ''بدیشی مہمان سے'' (سنہ درج نہیں) اور ''آہنگ جنون'' (سنہ درج نہیں) ایسی نظمیں ہیں جو بلند آہنگ ہیں۔ ان نظموں میں انقلاب لانے، سرمایہ داری کے خلاف لڑنے اور قصر سلطان پھونک دینے کی بات کہی گئی ہے۔ ان نظموں میں شاعر انقلاب جوش کے اسلوب کی پرچھائیاں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

مجاز سرتاپا حسن و عشق کی سرشاریوں کے شاعر تھے۔ وہ اپنے غنائی اسلوب لہجہ کی نرمی و نزاکت اور جذبات کی شفافیت کے بے محابا اظہار کے لیے یاد رکھے جائیں گے۔ اختر شیرانی کی سلمیٰ کی طرح اُن کے یہاں شہناز کا کوئی ماورائی تصور نہیں تھا بلکہ ضرورتوں کا ایسا پیکر تھا جسے مجاز نے دل کی پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا۔

عشق کی یوں تو ہزاروں توضیحات پیش کی جاتی رہی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ عشق کا سیدھا رشتہ بدن کی اسرار انگیز عقدہ کشائیوں سے ہوتا ہے۔ جنسی جذبات جب عمومی نہ رہیں اور کسی ایک فرد پر اس طرح مرکوز ہو جائیں کہ شعور اور لاشعور دونوں اُن کی گرفت میں آ جائیں تو وہ عشق کہلاتے ہیں۔ عشق میں ہم کسی بھی عورت یا مرد کی تلاش نہیں کرتے بلکہ ایک خاص عورت اور ایک خاص مرد کی گویا جنسی جذبات کی عمومیت جب تخصیص میں بدل جاتی ہے تو عشق کہلاتی ہے۔ اور مجاز کی زندگی اور شاعری اسی تخصیص کا سرنامہ ہے کہ اُن کا محبوب تخیلی نہیں حقیقی تھا۔ جیتا جاگتا زندہ تابندہ اور روشن۔

مجاز کی چھوٹی بہن حمیدہ سالم نے اپنی کتاب ''ہم ساتھ تھے'' میں اس احوال کی تفصیل یوں پیش کی ہے۔

''دلّی کے اس قیام کے دوران اسرار بھائی نے ایک ایسی چوٹ کھائی جس کا بھرنا تو درکنار مرہم اور پھائے کی گنجائش بھی نہ تھی..... محبت کی بساط پر اسرار بھائی نے ہاتھ بڑھایا تو ایسے چہرے کی طرف جس کا حاصل کرنا ناممکنات میں سے تھا۔ ایک شوخ و شنگ البیلی اور چنچل سی دوشیزہ دلّی کے ایک نامی گرامی ڈاکٹر مہم آزادی میں گاندھی جی اور پنڈت جی کے قریبی ساتھی کی انتہائی لاڈلی لے پالک بیٹی لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک بھاری بھرکم شوہر کی ملکیت جس کے نام وہ غالباً بچپن ہی سے کر دی گئی تھی۔ وہ دور سے مسکراہٹوں سے نواز سکتی تھی۔ اداؤں سے لبھا سکتی تھی۔ شاعر کی واہ واہ میں شریک ہو سکتی تھی لیکن اُن کی آہ میں شرکت اُس کے بس سے باہر تھی..... جب تک یہ رشتہ سماج کی نگاہوں سے محفوظ رہا دونوں ہی کے قدم بڑھتے رہے۔ شاعر محبت کے پھول قدموں پر بچھاتا رہا اور معاوضہ میں حسین اداؤں اور دلفریب مسکراہٹوں سے اپنے دل کو تسلی دیتا رہا۔ سودا مہنگا نہ تھا:

میرا نغمۂ باعث دلداری خوباں تو ہے
میرا نالہ خیر سے وجہ نشاط جاں تو ہے

عشق کی ناکامی محرومی اور مجبوری نے شاعر کے دل کو محزونی سے بھر دیا اسی کیفیت حزن و ملال میں انہوں نے سوز و کرب سے بھری ہوئی نظم ''مجبوریاں'' میں اپنی بے کسی اور بے بسی کا اظہار اس طور سے کیا:

وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اُس کو پوجتا ہوں اور اُس کو پا نہیں سکتا
یہ مجبوری سی مجبوری لاچاری سی لاچاری
کہ اُس کے گیت بھی جی کھول کر میں گا نہیں سکتا
زباں پر بیخودی میں نام اس کا آ ہی جاتا ہے
اگر پوچھے کوئی یہ کون ہے؟ بتلا نہیں سکتا
حدیں کھنچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

اعصاب پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوئے۔ پورا وجود خوف کی چادر میں لپٹ گیا نتیجہ کے طور پر ۱۹۴۰ میں نروس بریک ڈاؤن کا شدید دورہ پڑا۔ عدم تحفظ کا احساس شدت اختیار کرتا گیا۔ جنونی دورے پڑنا شروع ہو گئے۔ اضطرابی کیفیت بڑھتی چلی گئی۔ بقول حمیدہ سالم ''محبوبہ کا قرب نہیں تو ذکر ہی سہی۔ ٹیپ کا بند تھا وہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ رات رات بھر چھت پر یا کمرے میں ٹہلنا۔ خط پر خط لکھے جاتے۔ ایک آدھ خط کھول کر دیکھے گئے۔ اس میں جنسی تشنگی کا اظہار کچھ ایسے کھلے انداز میں کہ تہذیب میں ممنوع''۔

اعصاب کے ایک ادب نواز پروفیسر تھے۔ مجاز کی شاعری کام آئی۔ انہوں نے اُن کا نفسیاتی علاج شروع کیا۔ کچھ دنوں کے لیے بڑی بہن کے ساتھ الموڑا چلے گئے۔ تندرست و توانا ہو کر لوٹے۔ دلّی میں ہارڈنگ لائبریری میں دو سو روپے ماہانہ کی نوکری بھی مل گئی۔ مزاج کی آشفتگی نے وہاں بھی انہیں ٹھہرنے نہ دیا۔ معاشی ناہمواری کا بھوت ایک

بار انہیں ڈرانے اور دھمکانے لگا۔ پھر آوارہ خرامی اُن کا مقدر بنی۔ شراب پھر شروع ہوگئی، جس کا قطرہ قطرہ زہر انہیں پگھلاتا رہا۔

علی گڑھ میں دسمبر ۱۹۵۵ء میں یونین کا مشاعرہ تھا۔ مشاعرہ کا آغاز اُن کی نظم ''نذر علی گڑھ'' سے ہونا تھا، جسے یونیورسٹی کے ترانے کے طور پر پیش کیا جانا تھا۔ ذاکر صاحب کی فرمائش پر اشتیاق احمد خاں نے ''ترانے'' کی نہایت خوبصورت دھن بنائی تھی۔ ''ترانہ علی گڑھ'' ۱۷ر اکتوبر ۱۹۵۴ کو سرسیّد ڈے پر اسٹریچی ہال میں پیش کیا جاچکا تھا۔ مجاز اس سے باخبر تھے۔ مگر المیہ یہ تھا کہ پنی ناوقت موت کی بنا پر وہ اپنے جاوداں نغمے کو سننے سے محروم رہے۔ علی گڑھ سے مجاز کو اور مجاز کو علی گڑھ سے کتنی محبت تھی کتنی عقیدت تھی اس کا اندازہ ان اشعار سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے:

سرشار نگاہِ نرگس ہوں، پا بستہ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے، میرا چمن ، میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
ہر آن یہاں صہبائے کہن اک ساغر نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے پھولوں سے جوانی ابلتی ہے
جو طاقِ حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات ابلتی ہے
اسلام کے اس بت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی
تہذیب کے اس میخانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی
ہر شام ہے شام مصر یہاں ہر شب ہے شب شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں
جو ابر یہاں سے اُٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا ہر کوہِ گراں پر برسے گا

ناقدری دنیا نے ہم سے ایک بڑا شاعر چھین لیا جاتے جاتے وہ ہمیں اپنی شعری سوغات ''آہنگ'' کی صورت میں سونپ گیا ہے کاش ہم اس بیش بہا ادبی سرمایہ کا تحفظ کر سکیں۔

میں مجاز کے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجاز
ہم پر ہے ختم شام غریبان لکھنؤ

خالد علوی

مجاز کی شاعری اور شخصیت کے چند پہلو

ترقی پسند شعرا میں عوامی مقبولیت حاصل کرنے والے ادیبوں اور شعرا میں مجاز سرِ فہرست اور اولین ہیں۔ ان کی مقبولیت کی وجہ ان کی رومانی نظمیں اور ان کی دل نواز شخصیت کا جادو تھا۔ ترقی پسندی کے ابتدائی دور میں مجاز کو تمام ترقی پسند نقادانِ فن کی بے پناہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ ان کی شخصیت کے تعلق سے بھی ایسے جملے کہے گئے جن سے ان کی ایک خاص طرح کی امیج سازی ہوئی۔ مثلاً عصمت چغتائی نے کئی مقام پر کہا اور لکھا کہ گرلز کالج میں مجاز کے نام پر لاٹری ڈالی جاتی تھی۔ لڑکیاں اپنی آئندہ اولادوں کے نام مجاز کے نام پر رکھنے کی قسمیں کھاتی تھیں۔ اثر لکھنوی نے انھیں اردو کا کیٹس (KEATS) قرار دیا۔ کاظم علی خاں نے مجاز کا باقاعدہ موازنہ شبلی سے کر دیا۔ (علی گڑھ میگزین: مجاز نمبر) لیکن مجاز کے قریبی دوست میکش اکبر آبادی کے مطابق مجاز کی شخصیت، لباس اور وضع سب بجل اور درست ہونے کے باوجود بے کشش تھی ان کے گال بھی پچکے ہوئے تھے (علی گڑھ میگزین: مجاز نمبر، ص 28) لیکن مجاز کی رومانی نظمیں ان کے ترنم اور ان کی پُر مذاق شخصیت

نے ان کو بے حد مقبول اور مشہور کر دیا تھا۔ شاید استحقاق سے زیادہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حسرت، جگر کی بعد والی نسل میں کوئی دوسرا قابلِ ذکر شاعر منصۂ شہود پر موجود نہ تھا۔ فیض بھی اس وقت تک شمالی ہند میں طلوع نہیں ہوئے تھے۔

مجاز کی ابتدائی شاعری میں جوش کا اثر بہت نمایاں ہے۔ کہیں کہیں لاشعوری طور پر اقبال بھی مجاز کے ذہن میں موجود رہتے ہیں، جس کا ثبوت بعض نظمیں اور طرحی غزلیں ہیں۔ جوش کے علاوہ اختر شیرانی بھی مجاز کے آئیڈیل تھے، جن کا ذکر مجاز نے ایک نظم میں بھی کیا ہے:

یہ اپنے حسن میں عذرائے وامق
وہ اپنے ناز میں سلمائے اختر

یہاں اختر شیرانی کے ایک مشہور مصرعے 'تو اس سنسار میں ایک آسمانی خواب ہے سلمیٰ' کی طرف اشارہ ہے۔ اس زمانے میں اختر شیرانی اپنی مقبولیت کے عروج پر تھے اور ان کی بعض نظمیں ''یہی وادی ہے اے ہمدم جہاں ریحانہ رہتی ہے'' وغیرہ بہت مقبول تھیں۔ ترقی پسندوں میں اختر شیرانی کی مقبولیت کی وجہ یہ بھی تھی کہ اردو شاعری میں پہلی بار گوشت پوست کی عورت جلوہ گر ہوئی تھی۔ ڈاکٹر محمد حسن کا خیال ہے ''اختر شیرانی نے عنفوان شباب کی کیفیت زائیوں کو شاعری بنایا، مجاز نے اسے توسیع بخشی۔'' (معاصر ادب کے پیش رو، ص 52)

میر اور غالب کے بعد اردو کے واحد خوش قسمت شاعر 'مجاز' ہیں جن کی زندگی پر نہ صرف فلم بنی بلکہ ایک ناول 'غم دل وحشت دل' بھی لکھا گیا، لیکن ہم نے ابھی تک مجاز کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ان کی شاعری اور شخصیت پر معیزہ عثمانی اور منظر سلیم کی تصنیفات اور کئی خاص شماروں (علی گڑھ میگزین: مجاز نمبر اور مجاز ایک آہنگ) کے باوجود مجاز کی تصنیفات اور تخلیقات کی تفصیل کہیں بھی احاطۂ تحریر میں نہیں لائی گئی۔

مجاز کا کلام کس نام سے اور کتنی بار شائع ہوا ابھی تک کسی کو علم نہیں۔ عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ مجاز نے اپنا کلام پچاس روپیہ میں ایک ناشر کو فروخت کر دیا، اس نے 'سازِ نو' کے نام سے شائع کر دیا (علی گڑھ میگزین: مجاز نمبر، ص 146)۔ تقریباً یہی کلام پھر 'شب تاب' کے نام سے شائع ہوا پھر کچھ اضافے کے ساتھ 'آہنگ' کے نام سے شائع ہوا۔ ہندوستان اور پاکستان میں 'کلیاتِ مجاز' شائع ہونے کے باوجود 'مجاز' کا کافی کلام غیر مطبوعہ ہے۔ رانچی میں ذہنی علاج کے دوران مجاز نے کچھ نظمیں اور غزلیں کہیں جو بنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ 1960 میں رانچی میں منعقدہ ایک سیمینار میں نظر رانچوی نے ان تخلیقات کا حوالہ دیا تھا۔ اس سیمینار کی رپورٹ 'ہماری زبان' میں شائع ہوئی تھی۔ ان میں سے بعض اشعار حسب ذیل ہیں:

یوں تو دنیا میں کون کیا نہ ہوا
خبر گزری کوئی خدا نہ ہوا
کوئی مقام ہو ترا اپنے مقام سے گزر
برہنگی مہر و ماہ کچھ بھی سہی شکست ہے
نہ نیند آئی انھیں اور نہ مجھ کو نیند آئی
بجا رہی تھی ہوا جنگلوں میں شہنائی

ڈاکٹر محمد حسن مرحوم کی ڈائری میں بھی مجاز کا کچھ غیر مطبوعہ کلام محفوظ ہے جس کے مصرعے حسب ذیل ہیں:

؎ جو سروشبستاں ہے وہ چاک گریباں ہے
؎ دل برہم کے نالوں سے وہ کافر بدگماں کیوں ہو

یہی نہیں اردو تنقید نے بھی مجاز کے ساتھ کچھ کم ناانصافی نہیں کی۔ مجاز کو ایک مخصوص تحریک سے وابستہ کر کے اور ان کی شاعری سے غیر موجود معنیٰ برآمد کر کے مجاز کی

شاعری کو مبہم بنادیا گیا۔ کسی نے کیٹس کسی نے شیلی قرار دیا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے مجاز کی رومانویت کو حقیقت نگاری کا آہنگ بخشنے کی امتیازی حیثیت کا حامل بتایا۔ (معاصر ادب کے پیش رو، ص 52)۔ ایک اور مقام پر محمد حسن صاحب فرماتے ہیں:

> ''غزالوں کا جہاں، نجد تتار، علی گڑھ کے ترانے کی پوری فضا، بزم میں خنجر توڑنے کے تذکرے، قبائیں نوچنے اور تاج اچھالنے کا ذکر، یہ سب اردو شاعری میں دور متوسط کی عجمی بازیافت کا درجہ رکھتے ہیں۔'' (معاصر، ص 53)

مجاز کی نظم 'نذر علی گڑھ' میں کہیں بھی خنجر توڑنے، اور تاج اچھالنے کا ذکر نہیں ہے۔ محمد حسن صاحب کے ذہن میں مجاز اور فیض بری طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ اس رواروی نے بھی مجاز کو بہت نقصان پہنچایا۔ یہ بھی کہا گیا کہ مجاز کی عشقیہ شاعری میں ماضی کا تسلسل، حال کا شعور اور مستقبل کے خواب ملتے ہیں یا روح عصر کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ان کی عشقیہ شاعری میں انقلاب کے عناصر کی آمیزش ہے۔ یہ فرمودات نہ صرف گمراہ کن اور بے بنیاد ہیں بلکہ کسی حد تک مضحکہ خیز بھی ہیں۔ اختر انصاری نے لکھا تھا: ''دراصل اردو کے کسی رومانی شاعر کا کیٹس KEATS اور شیلے سے موازنہ کرنا فی الحقیقت اپنی علمیت کا مظاہرہ کرنا اور ناواقف لوگوں کو گمراہ کرنا ہے۔'' دراصل مجاز کی شاعری کا کافی بڑا حصہ صرف اور صرف عشقیہ اور رومانی شاعری ہے۔ جن میں انقلابی یا ترقی پسندانہ عناصر کا گزر نہیں۔ کچھ نظمیں کمزور ہیں اور کسی بھی فن کار کو زندہ رکھنے کے لیے قطعی ناکافی ہیں۔ اس طرح کی نظموں کے زمرے میں 'مزدوروں کا گیت، ہمارا جھنڈا، پاکستان کا ملی ترانہ، آہنگ نو، خواب سحر، بول اری او دھرتی بول، بدیشی مہمان سے، سرمایہ داری، وغیرہ کو رکھا جاسکتا ہے۔

مجاز کی بعض نظموں کے موضوعات ایسے ہیں جن پر دوسرے شعرا کی نظمیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً 'آج کی رات'، 'مادام'، 'انقلاب'، اور 'جشن آزادی' وغیرہ۔ 'آج کی رات'

کے عنوان سے اختر شیرانی، جوش، فیض اور مخدوم کی نظمیں بھی ہیں۔ ان تمام نظموں کے سامنے مجاز کی نظم کمزور اور پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ 'مادام' کے عنوان سے ساحر لدھیانوی کی نظم اور جشن آزادی پر فیض کی نظم 'صبح آزادی' اور جذبی کی نظم 'نیا سورج' سے مجاز کی نظم 'جشن آزادی' کا تقابل کافی مایوس کن نتائج برآمد کرتا ہے۔ فیض کی نظم بہت مشہور ہے۔ جذبی کی نظم 'نیا سورج' کسی حد تک علامتی نظم ہے۔ شاعر نئی صبح کی روشنی اور حرارت ٹھٹھرے ہوئے لوگوں تک پہنچانے کا آرزومند ہے۔

ارے او نئی شان کے میرے سورج
تری آب میں اور بھی تاب آئے
ترے پاس ایسی بھی کوئی کرن ہے
جو ایسے درختوں میں بھی راہ پائے
جو ٹھٹھرے ہوؤں کو ، جو سمٹے ہوؤں کو
حرارت بھی بخشے، گلے بھی لگائے

دراصل اس زمانے میں ترقی پسند شعرا کو مخصوص موضوعات پر ایک ہدایت نامے کے تحت نظمیں لکھنی ہوتی تھیں اس لیے ان نظموں میں گہرائی اور گیرائی نہیں آپاتی تھی۔ فرحت اللہ انصاری نے لکھا ہے: ''دوسری جنگ عظیم کے دوران 'نیا ادب' کے حلقے کے دوستوں نے مجاز اور جذبی سے سیاسی نظمیں لکھنے پر اصرار کیا تھا۔ جذبی نے 'اے سیاہی کھینچ اپنی خوں فشاں تلوار کھینچ' اور مجاز نے 'آج' لکھی۔ (بحوالہ مجاز حیات اور شاعری: منظر سلیم، ص 178)

دراصل مجاز کی انقلابی شاعری کی کمزوری کی دو وجوہات تھیں اول تو ہدایت نامے کے تحت شعر تخلیق نہیں کیا جاسکتا محض کلام موزوں خلق کیا جاسکتا ہے۔ دوئم مجاز کے اپنے ذہن میں انقلاب اور مارکسزم کا کوئی واضح تصور نہ تھا۔ بلکہ آل احمد سرور نے مجاز کے انقلابی

تصور کو رومانی اور طفلانہ قرار دیا ہے (علی گڑھ نمبر، ص 10)۔ سرور صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ مجاز نے زندگی اور ادب کے تصور کو نہ تو مطالعے سے جلا دی نہ زندگی کی آگ میں کود کر اسے گلزار بنایا۔ (ص 9)

دراصل مجاز کی شاعری میں انقلاب وغیرہ کی تلاش بے سود ہے۔ البتہ مجاز کی غزل اور نظم میں اردو کلاسیکی شاعری کا احترام، وقار اور توسیع ملتی ہے۔ سرور صاحب نے مجاز کے استعاروں اور تشبیہات کو اس کے خلاقانہ ذہن کا غماز کہا ہے۔ مجاز کی شاعری کا خوبصورت ترین پہلو ترکیب سازی اور اظہار پر ان کی غیر معمولی قدرت ہے۔ نہ صرف مجاز کے عہد میں بلکہ بعد میں بھی اردو شاعری میں اتنی خوبصورت تراکیب اتنی وافر تعداد میں کہیں نظر نہیں آتی۔

'زمزمہ سنج ونغمہ خوان، مطرب بزم دلبراں، خلد کی ترہت ونکہت جواں، سرمہ چشم گلرخاں، خنجر بے نیام شوق، گرمی بزم سرکشی، زخمہ زن ساز بہار، لب لعلین نگار، میر حنا بندی، انوار تمکنت، کارواں نکہت بستاں، خورشید نیم شب، لیلیٰ ناز برافگندہ نقاب، نشہ نرگس خوباں، پرتو قندیل رہبانی، خستان فلک، سرشار نگاہ نرگس، پابستہ گیسوئے سنبل، دل صد پارہ حوادث، قندیل رہبانی، آہنگ حدی خوانی، سجدہ طراز شوق، آزردۂ تمیز، لطف وجود، داماندۂ افکار تنہائی، زخمی سوفار مژگاں، رہین لب شکر افشاں، افتادگان عیش عشرت وغیرہ وغیرہ۔

مجاز کی اکثر نظموں میں تکرار کا عیب موجود ہے۔ وہ جوش کی مرکوز نہیں رہ پاتے۔ بے ضرورت نظموں کو طول دیتے ہیں اور ارتقائے خیال کی فکر نہیں کرتے۔ اکثر مصرعوں کا نظم کے مرکزی خیال سے کوئی تعلق قائم نہیں ہوتا۔ مجاز اگرچہ بعض مواقع پر جوش ملیح آبادی سے سخت ناراض ہوئے لیکن جوش کے اثرات سے تاحیات چھٹکارہ حاصل نہ کر سکے۔ جوش نے جب 'پند نامہ برائے اصلاح میاں مجاز' لکھی اور 'آجکل' میں شائع کر دی تو مجاز سخت ناراض ہوئے اور دو قطعات میں جواب دیا:

پیر جوش شباب کیا جانے
شورش اضطراب کیا جانے
سینہ انقلاب چھلنی ہے
شاعر انقلاب کیا جانے
نطق رسوا ذہن دریدہ ہے
یہ شنیدہ نہیں ہے دیدہ ہے
رند برباد کو نصیحت ہے
شیخ کی شان میں قصیدہ ہے

آخری مصرعے میں جوش کی نظم 'شیخ عبداللہ' کی طرف اشارہ ہے جس کا ایک شعر ہے:

صرف ایک شیخ سے محبت ہے
ورنہ ہر شیخ سے خدا کی پناہ

لیکن اس شکر رنجی کے باوجود جوش کے اثرات مجاز کی اکثر نظموں میں نظر آتے ہیں۔ جوش صاحب نے روایتی غزل گویوں کو ہدف بناتے ہوئے ایک نظم میں یہ شعر کہا تھا جس میں 'ڈھڈو' کو نظم کیا ہے:

جو والد ماجد کی شبستاں کی پری تھی
اب تک اسی ڈھڈو سے ہے راتوں کو ملاقات

مجاز نے اپنی نظم سرمایہ داری میں 'ڈائن' کو یہ اعزاز بخشا ہے:

جواں مردوں کے ہاتھوں سے یہ نیزے چھین لیتی ہے
یہ ڈائن ہے بھری گودوں سے بچے چھین لیتی ہے

جوش کی بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنی نظموں کی خارجی آرائش کرتے وقت معنی

آفرینی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ہم مخرج، ہم آہنگ اور گوش زیب الفاظ جمع کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً 'آگ' کا یہ بند:

آگ دانائی، تامل، دور بینی آگہی
آگ جولانی، حرارت مسکراہٹ روشنی
آگ بہتی سرخوشی، مستی، جوانی، زندگی
آگ گویائی، خطابت، شاعری پیغمبری

یہی نہیں 'آگ' کے دوسرے بندوں میں بھی آگ کو لالہ و نسرین کا ناز، چمپئی مکھڑوں کا ناز، پاک طینت اور پاک باز کہا گیا ہے۔ جس کا آگ کی خصوصیات سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ مجاز نے بھی یہ فن جوش صاحب سے ہی سیکھا ہے۔ ان کی نظموں کے بعض ٹکڑے بھی نظموں کے موضوعات سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ یہاں میں مجاز کی نظم 'رات اور ریل' کے کچھ ایسے مصرعوں کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جن کا نفسِ مضمون سے کوئی رشتہ نہیں ہے:

ایک دلہن اپنی ادا سے آپ شرمائی ہوئی
جیسے آدھی رات کو نکلی ہو اک شاہی برات
جیسے موجودں کا ترنم، جیسے جل پریوں کے گیت
ٹھوکریں کھاتی لچکتی، گنگناتی جھومتی
رینگتی، مڑتی، مچلتی، تلملاتی، ہانپتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبرائی ہوئی
ایک مجرم کی طرح سہمی ہوئی، سمٹی ہوئی
ایک مفلس کی طرح سردی میں تھرّائی ہوئی
ایک ایک حرکت سے اندازِ بغاوت آشکار

یہی نہیں بلکہ 'مجاز' کی مشہور ترین نظم 'آوارہ' کا بھی ان مبینہ نظریات سے کوئی تعلق

نہیں ہے جن کی بنا پر اکثر ترقی پسند نقادوں نے 'آوارہ' کو اہم نظم تسلیم کرلیا ہے لیکن غور کرنے پر یہ نظم بھی شعور کی رو کے زیر اثر کہا گیا گیت معلوم ہوتی ہے، جس میں تشبیہات اور اکثر بندوں کا ربط ظاہر نہیں ہوتا۔ نظم میں وحدت خیال اور وحدت تاثر ضروری ہے جس سے 'آوارہ' محروم ہے۔ اسی لیے 'آوارہ' کو گیت کہنا مناسب ہے:

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ ، جیسے بنیے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں
ہر طرف بکھری ہوئی، رنگینیاں، رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

مجاز کی نظم 'رات اور ریل' کے بارے میں آل احمد سرور نے کہا تھا کہ ارتقا اور سماج کے لفظ تو تعویذ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں مگر نظم میں بڑے شگفتہ اور رواں الفاظ میں ریل کی رفتار کو قلم بند کرلیا گیا ہے۔ سرور صاحب بڑی شرافت سے نہ صرف مجاز بلکہ اکثر ترقی پسندوں کی کمزوریوں کی نشاندہی کردی ہے۔ جہاں بعض الفاظ تعویذ کے بطور استعمال ہوتے ہیں۔ مجاز کی اکثر نظموں میں یہ تعویذ موجود ہے۔

مجاز کی اس قبیل کی نظموں کا ذکر موقوف کرکے ان شخصی نظموں پر توجہ کرتے ہیں جن میں سے اکثر میں تو مجاز خود ہی موجود ہیں لیکن چند نظموں میں ایسے نسوانی کردار بھی موجود ہیں جن سے مجاز کی جذباتی وابستگی تھی۔ سب سے پہلے اس بزرگ خاتون کا ذکر جو کسی نظم کا کردار تو نہیں ہیں لیکن مجاز نے طفولیت میں ان کی خوبصورتی سے بہت اثر لیا اور اپنی

چھوٹی بہن ذکیہ کا نام بدل کر ان خاتون کے نام پر 'حمیدہ' رکھ دیا۔ حمیدہ سالم نے لکھا ہے:

''جگن بھیا (مجاز) بچپن سے بہت حسن پرست تھے۔ کوئی خوبصورت بی بی دیکھ لیں پھر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس کے پاس گھنٹوں بیٹھے رہتے کھیل کود کھانے پینے کسی چیز کا ہوش نہ رہتا۔ میری پیدائش کے وقت لکھنؤ سے ایک خوبصورت دلہن رودولی بیاہ کر آئیں۔ ان کا نام حمیدہ تھا ان کے پیچھے جگن بھیا کی دیوانگی کا یہ عالم تھا۔ میرا نام ذکیہ رکھا گیا تھا ضد کر کے بدلا اور حمیدہ رکھ دیا۔'' (علی گڑھ میگزین: مجاز نمبر، ص 35)

میری کوشش تھی کہ کسی طرح حمیدہ صاحبہ کے بارے میں معلومات حاصل کروں کچھ تفصیلات اگر مع فوٹو مل جائیں تو بہت اچھا ہو۔ کافی تگ ودو کے بعد تفصیلات سے آگاہی ہوئی۔ راقم الحروف ان خاتون سے 90-1989 میں مل چکا تھا۔ اب جب ان کا انتقال ہوئے زمانہ گزر چکا ہے تو تفصیل معلوم ہوئی۔

حمیدہ خاتون صاحبہ اودھ کے ہی چھوٹے سے قصبے ستر کھ کی رہنے والی تھیں۔ ان کے والد چودھری نعمت اللہ ستر کھ کے اچھے خاصے بڑے جاگیردار تھے۔ حمیدہ صاحبہ کی شادی رودولی کے ساکن انعام الرحمٰن صاحب سے ہوئی تھی، جو رودولی کے باشندے ضرور تھے لیکن سرکاری ملازمت کی وجہ سے یوپی کے مختلف مقامات پر منتقل ہوتے رہتے تھے۔ وہ گورنمنٹ کوآپریٹو ملازم تھے۔ حمیدہ صاحبہ کے دو بیٹیاں اور ایک بیٹے تھے جو آج بھی لکھنؤ میں مال ایونیو میں قیام پذیر ہیں۔

مجاز کا پہلا جذباتی تعلق کنیز عطاء اللہ سے ہوا جو کافی خوبصورت اور مہذب لڑکی تھی۔ کنیز آئی ٹی کالج لکھنؤ کی طالب علم تھی۔ ان ہی کنیز سے رشید جہاں نے مجاز کا باقاعدہ پیام دیا تھا لیکن کنیز نے انکار کر دیا۔

آئی ٹی کالج کی ہی دوسری طالبہ ثریا جبیں کو بھی مجاز پسند کرتے تھے یہ فارسی کی استاد تھیں ان کا قد کافی دراز تھا۔ مجاز نے ان پر ایک نظم بھی لکھی تھی جو ان کے مجموعے میں شامل نہیں ہے اسی نظم کا ایک شعر ہے:

بھری محفل میں چھلکایا جام آتشیں میں نے
زمیں سے اڑ کے چومی ہے ثریا کی جبیں میں نے

لیکن مجاز نے دہلی میں ایک ایسا عشق کیا جس کی کسک ساری زندگی محسوس کرتے رہے۔ اسی چوٹ نے مجاز کو ذہنی مریض بنا دیا۔ مجاز نے اپنی متعدد نظموں میں اس عشق کا ذکر کیا ہے۔ کبھی کبھی براہ راست نام کے ساتھ کبھی اشاروں میں۔ سب سے پہلے 'نذر خالدہ' میں حوالہ نظر آتا ہے:

ذکر جس کا زہرہ وپرویں کے کاشانے میں ہے
وہ صنم بھی آج اپنے ہی صنم خانے میں ہے

'کس سے محبت ہے' میں بھی براہِ راست ذکر کرتے ہیں:

ثریا بخت ہے زہرہ جبیں ہے ماہ طلعت ہے
مرا ایماں ہے میری زندگی ہے میری جنت ہے

'عشرت تنہائی' کے پہلے ہی بند میں:

ماہ پاروں کا ہدف، زہرہ جبینوں کا شکار
نغمہ پیرا و نوا سنج و غزل خواں ہوں میں

'شکوہ مختصر' کا اولین شعر:

مجھے شکوہ نہیں دنیا کی ان زہرہ جبینوں سے
ہوئی جن سے نہ میرے شوق رسوا کی پذیرائی

'بتان حرم' کا یہ شعر:

جام زرّیں کی کھنک قلقل مینا کے ساتھ
قدسیوں کی لے سرودِ بربط زہرا کے ساتھ

کہیں کہیں 'زہرہ' کے دوسرے ہم معنی لفظ 'ناہید' کے حوالے سے ذکر کرتے ہیں:

بلبلیں نغمہ سرا ہیں تری ہی تقلید میں
ترے ہی نغموں سے رہویں محفل ناہید میں

'میرا چمن':

اس فرش سے ہم نے اڑ اڑ کر افلاک کے تارے توڑے ہیں
ناہید سے کی ہے سرگوشی، پروین سے رشتے جوڑے ہیں

'اعتراف':

خاک تھے دیدۂ بیباک میں گردوں کے نجوم
بزم پرویں تھی نگاہوں میں کنیزوں کا ہجوم

مجاز کے اس لازوال عشق کا مرکز زہرہ انصاری تھیں، جو ڈاکٹر مختارالدین انصاری کے بھائی کی بیٹی تھیں لیکن ڈاکٹر انصاری نے ان کو گود لے لیا تھا اور اپنے چچازاد بھائی کے بیٹے شوکت انصاری سے شادی کر دی تھی۔ شوکت انصاری بہت سے ممالک میں ہندوستان کے سفیر رہے بعد میں اڑیسہ کے گورنر ہوئے۔ شوکت انصاری بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے۔ کیمبرج سے بار ایٹ لا کیا تھا۔

اس وقت ڈاکٹر انصاری کا قیام دریا گنج میں تھا۔ ڈاکٹر انصاری کی یہ کوٹھی اس وقت سیاسی تحریکات کا مرکز تھی۔ جواہر لال نہرو تقریباً ہر ہفتے یہاں آ کر قیام کرتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری جنگ بلقان کے بعد ڈاکٹروں کا ایک وفد لے کر ترکی گئے تھے، جہاں جنگ کے زخمیوں کا علاج کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر انصاری ترکی میں مقبول تھے۔ ترکی کی خالدہ ادیب خانم جب ہندوستان آئیں تو ڈاکٹر انصاری کی رہائش گاہ پر قیام کیا۔ خالدہ ادیب

خانم جب علی گڑھ گئیں تو ڈاکٹر انصاری نے زہرہ انصاری کو ان کے ہمراہ علی گڑھ بھیجا۔ مجاز نے خالدہ ادیب خانم کے استقبال میں ایک نظم 'نذرِ خالدہ' پڑھی۔ یہ مجاز اور زہرہ انصاری کی پہلی ملاقات تھی۔ 'نذرِ خالدہ' کے ایک شعر میں زہرہ کی طرف ہلکا سا اشارہ ملتا ہے ممکن ہے وہ شعر بعد میں شامل کیا گیا ہو۔

علی گڑھ کی ملاقات کے بعد مجاز کی زہرہ انصاری سے دوسری ملاقات دہلی میں دریا گنج میں ہوئی پھر تو ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ شوکت انصاری خود ادب کا بہت رچا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے مجاز سے درخواست کی کہ وہ کسی وقت بھی ٹیلی فون کر کے آسکتے ہیں۔ مجاز نے اس پیش کش کا کافی فائدہ اٹھایا۔ زہرہ کے علاوہ دوسری وجہ شراب تھی جو شوکت انصاری ان کو پیش کرتے تھے۔ ایک بار مجاز بغیر اطلاع کے پہنچ گئے اس وقت شوکت انصاری گھر پر موجود نہیں تھے، زہرہ انصاری نے چائے پیش کی اسی درمیان شوکت انصاری آگئے تو انھوں نے زہرہ سے کہا ارے بھئی مجاز صاحب کو چائے پلا رہی ہو ان کا مشروب لاؤ۔ اس کے بعد مجاز کو غیر ملکی شراب پیش کی گئی۔

شوکت انصاری اور زہرہ انصاری مجاز کے مداح اور شاعری کے شوقین تھے لیکن وہ مجاز سے ہمدردی تو رکھتی تھیں لیکن کوئی جذباتی رشتہ نہیں تھا۔ یہ عشق تمام وکمال یک طرفہ تھا۔ جب لکھنؤ اور دہلی میں اس عشق کی داستان دوہرائی جانے لگی (کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مجاز خود ہی عشق کی داستانوں کو بیان کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جنون کے دنوں میں بھی وہ اکثر لڑکیوں کے نام لیتے تھے کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہیں) تو شوکت انصاری کو بہت ناگواری ہوئی۔ انھوں نے ایک دن زہرہ سے کہا کہ مجاز آج کل عشق کر رہے ہیں۔ زہرہ خوش ہوئیں کہ شاید اس شاعر کی زندگی میں استقلال آجائے۔ انھوں نے مسرور ہوکر کہا ''ارے یہ تو خوشی کی بات ہے کس سے عشق کر رہے ہیں؟''

''جی آپ ہی سے'' شوکت انصاری نے جواب دیا۔

اس شہرت کے بعد زہرہ انصاری کے رویے میں تھوڑی سی سرد مہری آ گئی۔ حالاں کہ پہلے بھی زہرہ اپنی پسندیدگی کے باوجود ایک پُر وقار فاصلہ رکھتی تھیں۔

ڈاکٹر انصاری کا اچانک انتقال ہوگیا۔ دریا گنج، انجمن ترقی اردو کو دے دیا گیا اور انصاری خاندان سول لائنز کی ایک کوٹھی میں منتقل ہوگیا لیکن وہاں مجاز کا داخلہ ممنوع ہوگیا تھا۔ 1947 میں فسادات کے دوران شر پسندوں نے اس کوٹھی کو آگ لگادی۔ زہرہ انصاری کے ایک ہندو پڑوسی نے ان کی جان بچائی۔ گاندھی جی نے اپنی روزانہ کی صبح گاہی دعا میں ذکر کیا کہ شر پسندوں نے ڈاکٹر انصاری جیسے وطن پرست کا گھر بھی جلادیا اور ان کی بیٹی زہرہ کو بے گھر کردیا۔ گاندھی جی کی دعا آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتی تھی۔

مجاز کی بہت سی نظموں میں زہرہ کے فاصلے اور عصمت و تقدیس کے نظریات پر سوال کھڑے کیے گئے ہیں:

نگاہوں کی دعوت کو پامال کرنا
مذاق لطافت کو پامال کرنا
تقاضائے فطرت کو پامال کرنا
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں

(پردہ اور عصمت)

زباں پر ہیں ابھی تک عصمت و تقدیس کے قصے
وہ بڑھ جاتی ہے اس دنیا میں اکثر اس قدر آگے
مری تخیل کے بازو بھی اس کو چھو نہیں سکتے

(کس سے محبت ہے)

مجاز نے اپنی کئی نظموں مثلاً 'بتان حرم'، 'مادام'، 'ایک غمگین یاد'، 'مجبوریاں'، 'نذر دل'، 'عبادت' اور 'شہر نگار' کے دوسرے حصے میں اپنے اس عشق کے حوالے دیے ہیں۔

اگرچہ شوکت انصاری کو بخوبی علم تھا کہ مجاز کا عشق یک طرفہ تھا لیکن یہ تعلق ہمیشہ پھانس بن کر ان کے دل میں کھٹکتا رہا اور وہ ہمیشہ زہرہ سے کھنچے کھنچے رہے۔ شوکت انصاری کے انتقال کے بعد زہرہ کافی عرصے تک حیات رہیں۔ زہرہ کے تینوں صاحبزادگان میں بہجت انصاری، جو سب سے بڑے تھے، لندن میں مشہور ڈاکٹر تھے۔ زہرہ انصاری آخر عمر میں گلے کے کینسر میں مبتلا ہوئیں۔ بہجت انصاری ان کو لندن لے گئے جہاں آپریشن ٹیبل پر ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ وقت کا ظلم ملاحظہ کیجیے زہرہ انصاری مجاز کے اولین پسندیدہ خاتون حمیدہ کے داماد کی بہن تھیں۔

مجاز کی نظم 'نورا' کے حوالے سے بھی ان کے ایک عشق کا ذکر کیا جاتا ہے:

وہ فردوس مریم کا اک غنچہ تر
وہ تثلیث کی دختر نیک اختر
سرہانے مرے ایک دن سر جھکائے
وہ بیٹھی تھی تکیے پہ کہنی ٹکائے
مجھے لیٹے لیٹے شرارت کی سوجھی
جو سوجھی تو کس قیامت کی سوجھی
ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکالی
لب لعل افشاں سے اک شے چرالی
میں سمجھا تھا شاید بگڑ جائے گی وہ
ہواؤں سے لڑتی ہے لڑ جائے گی وہ
ادھر دل میں اک شور محشر بپا تھا
مگر اس طرف رنگ ہی دوسرا تھا
ہنسی اور ہنسی اس طرح کھلکھلا کر

کہ شمع حیا رہ گئی جھلملا کر
نہی جانتی ہے مرا نام تک وہ
مگر بھیج دیتی ہے پیغام تک وہ
یہ پیغام آتے ہی رہتے ہیں اکثر
کہ کس روز آؤ گے بیمار ہوکر

اکثر ترقی پسندوں نے 'نورا' کو حقیقی عورت کی طرح تعبیر کیا ہے۔ عصمت چغتائی نے نرس کے نہ شرمانے کو روشن خیالی سمجھا ہے:

''میں نے کہا ''نرس کی چارہ گری' میں آپ نے قدامت پرستی کا ثبوت دیا ہے کہ جب آپ نورا کے لبوں سے وہ لطیف شے چرا لیتے ہیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ زمانہ قدیم کی معشوقاؤں کی طرح وہ شرما کر نخرہ کرے گی بگڑ جائے گی۔ پر جب وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تو آپ کو بے حیا معلوم دی۔'' (عشق مجازی: مجاز ایک آہنگ، ص255)

ڈاکٹر محمد حسن بھی اس بوسے کو حق بجانب ٹھہراتے ہیں:

''مجاز نے نیم بے خودی میں نیم سرشاری میں ادھ کھلی آنکھوں سے نورا کو دیکھا اور اس کے جوان شاداب ہونٹوں کو چوم لیا یہ گویا ایسی عورت کو خراج تحسین تھا جو جدید دور کی باہمت اور حوصلہ مند دوشیزہ کے تصور کو پورا کر رہی تھی۔'' (غم دل وحشت دل: محمد حسن)

دراصل مجاز کو اس عمل (بوسہ) سے بہت دلچسپی تھی وہ زیب داستان کے لیے ہر محبوبہ کے لب چومنے کا ذکر ضرور کرتے ہیں:

آہ وہ دوشیزہ لب، گل ریز لب، گلنار لب
آہ وہ لب آشنا لب، شوخ لب، خونبار لب

(بتان حرم)

ہوگئی تشنہ لبی آج رہین کوثر
میرے لب پر لب نعلین نگار آ ہی گیا

(شہر نگار)

ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکالی
لب لعل افشاں سے اک شے چرالی

(نورا)

حقیقت یہ ہے کہ 'نورا' کے سلسلے میں جتنی بھی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں وہ سب بے بنیاد ہیں۔ دراصل 'نورا' نام کی کوئی دوشیزہ موجود تھی ہی نہیں۔ دہلی میں جذبی صاحب جہاں رہتے تھے اسی عمارت میں ایک عیسائی خاندان بھی رہتا تھا۔ جس کی نوجوان لڑکی کسی ہاسپٹل میں نرس تھی۔ روزانہ سفید لباس زیب تن کر کے جب وہ ڈیوٹی پر جاتی تو اس لباس میں جذبی صاحب کو بہت اچھی لگتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ زمین سے آسمان تک سفید لباس کی وجہ سے نور بکھر جاتا ہے اس لیے جذبی نے اس نرس کا نام 'نورا' رکھ دیا تھا۔ صرف اتنی حقیقت ہے کہ اس کے علاوہ کوئی سچائی نہیں ہے۔ یہ بھی مجاز کے طرف آگیں مذاق کا ایک المیہ حصہ ہے۔

آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ آئندہ نسلوں کو تعجب ہو کہ مجاز اپنے زمانے میں کیوں اس قدر محبوب تھے؟ پھر خود ہی جواب دیا ہے کہ دراصل مجاز حسن کی ہر ادا کا رمز شناس ہے۔ اس کی پرستش میں عاشق کا جذب وجنون ہے۔ اس بصیرت نے اس کے اشعار میں ایک سرمستی اور کیفیت بھر دی ہے۔ الفاظ میں جادو بھر دیا ہے۔ اس نے درد وداغ، آرزو

اور جستجو کا جو خزانہ دیا ہے اس سے ہم کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ ہمارے پاس سرور صاحب سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں ہے اور یہی مجاز کی معنویت ہے۔

(اس مضمون میں پروفیسر محمد حسن، پروفیسر قمر رئیس، معین احسن جذبی، مجروح سلطانپوری کی بعض یادداشتوں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ قمر رئیس، معین احسن جذبی، اور مجروح سلطانپوری سے انٹرویو روزنامہ 'امر اجالا' کے بعض اشاعتوں میں شائع ہوئے تھے جب دہلی میں ترقی پسند تحریک کی پچاس سالہ تقریبات کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مشہور رہنما ڈاکٹر ایم اے انصاری کی پوتی ڈاکٹر صبا انصاری نے بھی بعض معلومات فراہم کیں۔ صمیم قلب سے ان کا بھی شکر گزار ہوں۔

ریاض قدوائی

مجاز کی مزین معنویت اور مقصدیت

فیض آباد اودھ کی پہلی راجدھانی تھی اور ایک زمانے میں جب اس شہر کی رونق اپنے عروج پر تھی اس کی آبادی اپنے وقت کی دہلی کے مقابلے میں چار گنی بتائی گئی ہے۔ لکھنؤ اس کے بعد دارالحکومت بنا اور حکومت اودھ کا عروج و زوال ہوا۔ اس وجہ سے ان دونوں شہروں کے درمیان واقع علاقوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوئی۔ رودولی ان ہی قصبات میں سے ایک ہے اور فیض آباد سے کچھ پہلے آتا ہے۔ رودولی کے ایک زمیندار گھرانے میں جو کافی حد تک تعلیم یافتہ بھی تھا سراج الحق صاحب کے بیٹے اسرارالحق کی پیدائش (۱۹۱۱ء میں) ہوئی جو دنیا میں مجاز کے نام سے مشہور ہوئے۔ مجاز صاحب کے بارے میں ان کی ایک چھوٹی بہن حمیدہ سالم، بڑے بہنوئی اور اس سے زیادہ ان کے ۲۵ سال کے دوست، جاں نثار اختر، عصمت چغتائی اور دوسروں نے بہت کچھ لکھا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہاں میں پہلے مجاز صاحب کے تعلق سے اپنے ابتدائی عمر کے تاثرات بیان کرتا ہوں:

ایک یادگار مشاعرے میں میں نے فراق گورکھپوری کی
زبان سے ان کا یہ شعر سنا تھا جو دل پر نقش ہو کر رہ گیا....

آنے والی نسلیں تم پر ناز کریں گی ہم عصرو
ان کو جب معلوم یہ ہوگا تم نے فراق کو دیکھا تھا

یہ فراق کی تعلّی نہیں بلکہ حقیت کا بیان تھا۔ یعنی آج امر واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ کم از کم ہم خود تو اپنے آپ پر ناز کر ہی سکتے ہیں کہ ہم نے فراق جیسی عبقری شخصیتوں کو دیکھا تھا۔ یہ بات مجاز پر بھی صادق آتی ہے یعنی ان کو دیکھنے اور سننے والوں کے لیے یہ مایۂ ناز ہے۔ میری عمر اس وقت ماں باپ کی انگلی پکڑ کر چلنے والی تھی جب میں نے سنا کہ مجاز صاحب اسپتال میں قریب المرگ حالت میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ بھی دیکھا کہ اس واقعے کی وجہ سے لکھنؤ کے گنگا پرشاد ہال میں جاری تین یا چار روزہ کانفرنس کی رونق غائب سی ہوگئی تھی جس میں ترقی پسند رجحانات اور شخصیات کا غلبہ تھا۔ ایک دن پہلے ساحر لدھیانوی نے میرے بھائی کی آٹوگراف بک پر ان کی عمر کی مناسبت سے یہ شعر لکھا تھا....

ہزار برق گرے، لاکھ آندھیاں آئیں
وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں

دوسرے دن جب میں نے بھائی کی تقلید میں اپنی آٹوگراف ساحر کی طرف بڑھائی تو اس پر ساحر کے گھسیٹ خط میں لکھا ہوا شعر (جو مجھے دوسروں نے پڑھوایا) مجھ کو کچھ اچھا نہیں لگا اور سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ شعر یہ تھا:

مری ندیم محبت کی رفعتوں سے نہ گر
بلند بام حرم ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

ایک دن میں اتنا فرق ہوگیا تھا۔ پہلا شعر بالکل موقع کے مطابق اور موزوں تھا، دوسرا مخاطب کی عمر کے لحاظ سے بے تکا۔ میں نے اپنے گھر والوں کو کہتے سنا کہ مجاز صاحب کی

حالت کی وجہ سے ساحر کا دماغ حاضر نہیں تھا۔ لہٰذا جلدی میں یہ شعر لکھ دیا۔ سردی سے اکڑ جانے کے بعد اسپتال میں غالباً تیسرے دن مجاز صاحب کے انتقال کی خبر آئی۔ حالانکہ ہر ایک کو اس کا اندیشہ تھا پھر بھی ہر دل سن ہو گیا، ہر آنکھ سوگ کی تصویر بن گئی۔ مدتوں تک ان کا غم منایا گیا۔ کسی اور شاعر، ادیب کے لیے ایسے ذاتی غم کی فضا نہ اس سے پہلے دیکھی گئی اور نہ بعد میں۔ نیاز حیدر نے اپنے عام گھن گرج والے لب ولہجہ کے برخلاف ان کی یاد میں ایک بے حد خوبصورت نظم لکھی جو کچھ طویل بھی تھی۔ اس کے اجزاء ہیں:

قلق ہوتا ہے اس کا جام خالی دیکھ کر ساقی
نہ آئے وہ مگر اس جام کو لبریز رہنے دے
کہ یاد یار کا یہ چاند آنکھوں سے نہ ہو اوجھل
بہ نام سوز دل ساغر کی گردش تیز رہنے دے

وہ متوالا مغنی جس کے نغموں کی تجلی پر
مے و مینا کی قسمت کے ستارے ناز کرتے تھے
شگفتہ گل کا دیوانہ وہ شیدا خوب روؤں کا
وہ جس کی پیروی رندان شاہد باز کرتے تھے

--

یہ نظم انہوں نے مجاز کے انتقال کے فوراً بعد نہیں بلکہ خاصا عرصہ گزر جانے پر کہی تھی۔ انہوں نے اپنے دوستوں پر جو نقش چھوڑا تھا وہ اتنا ہی گہرا اور دیرپا تھا۔ میرے والد شایاں قدوائی گھر میں کسی بھی دوسری شخصیت سے زیادہ مجاز ہی کی باتیں کیا کرتے تھے۔ عمر کے کچھ کچھ پختہ ہونے کے ساتھ یہ باتیں کسی حد تک میرے پلے پڑنے لگی تھیں۔ مجاز کی پرمزاح طبیعت کے ساتھ ان کا غصہ، اور ان کی بے حد گہری پرمعنی باتیں۔ ان کی نصیحتیں اور

مشورے جو والد کو دیا کرتے تھے۔ مجاز کے بارے میں انہوں نے کئی قطعات لکھے:

اک آئینہ ہے جس میں چاند سے چہرے نظر آئے
اور اس میں اپنے گیسو مہ جبینوں نے سنوارے ہیں
اس آئینے میں وحشت ناک شکلیں بھی نظر آئیں
اور اس پر وحشیوں نے دوڑ کر پتھر بھی مارے ہیں

اور یہ شعر:

رخصت ہے آہ شاعر وارفتہ دل مجاز
اب درد و غم میں حسن کہاں بانکپن کہاں

وہ شعر کی زبان کے معاملے میں مجاز کی حساس طبیعت کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ مجاز کی شاعری کی زبان کے پہلو پر ان سطروں میں آگے چل کر گفتگو ہوگی۔ یہاں ذکر اس بات کا ہے کہ زبان کے معاملے میں ان کا معیار صرف اپنے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے بھی تھا۔ تنہائی میں ایک مرتبہ انہوں نے میرے والد کا شعر سن کر اس بات پر ناراضگی ظاہر کی کہ انہوں نے ترکیب ''عزم انسان'' کو نظم کیا تھا۔ کسی بھی صورت سے ''عزم انساں'' کہنا چاہیے۔ غلطی یوں تو بظاہر معمولی تھی لیکن بہت بڑی بھی تھی۔ وقتی اور اتفاقیہ مجلسوں اور اپنے مستقل حلقہ فکر میں اپنے ان مشوروں کے ذریعہ انہوں نے شعر میں روانی اور فصاحت کے معیاروں کو دوبارہ قائم کیا۔

مجاز نے جس طرح شاعری اور پورے ادب کی تاریخ بنائی ہے اس حقیقت کے مختلف پہلوؤں پر گذشتہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ میں بہت کچھ روشنی ڈالی جا چکی ہے اور اس سمینار میں بھی کافی کچھ کہا گیا۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا کیونکہ مجاز کے فن کے بارے میں کہنے کو ہے ہی اتنا کچھ۔ جتنا زیادہ اس کو دیکھا جائے گا اتنی ہی پرتیں کھلیں گی اتنے ہی محاسن سامنے آئیں گے۔ معائب اگر کچھ ہیں تو ان پر بھی نظر جانا چاہیے لیکن زاویہ عیب جوئی کا ہو تو دیانتداری میں لازمی طور سے شبہ کیا جائے گا۔ مجاز خصوصاً اس کا نشانہ بنے ہیں۔ یہاں

ایک بات کہنا ہے کہ مجاز کے فن کو پرکھتے وقت اس کو ان کی ذات اور شخصی کردار کے ساتھ خلط ملط نہ کیا جائے۔ جب ہم غالب یا کسی اور کے فن پر نظر ڈالتے ہیں تو ایسا نہیں کرتے۔ الگ سے ان موضوعات پر لکھا جاتا ہے جو ان کے شب و روز، عادات و اطوار وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

مجاز کی شاعری کی جو خصوصیات مجھے نظر آتی ہیں وہ یوں تو بے شمار ہیں، لیکن خصوصاً تین چار پہلوؤں پر یہاں انتہائی مختصر گفتگو کرنا ہے۔ ایک تو ان کی زبان۔ یہ اس قدر نتھری ہوئی دھلی دھلائی زبان ہے کہ شاید ہی کوئی ماہر سخن وران کے کسی مصرعے کی نشستِ الفاظ کی اصلاح کر سکے یا اس کو یوں سے یوں کرنے کا مشورہ دے سکے جب کہ غالب اور اقبال کے اشعار کے معاملے میں ایسا ہوا ہے۔ لکھنؤ میں زبان کی پرداخت اور تراش خراش کا سلسلہ پرانا ہے۔ مصحفی کے بارے میں مستند ذرائع سے مشہور ہے کہ وہ زبان کے امور پر اپنے شاگردوں کی باقاعدہ کلاس لگایا کرتے تھے اور لیکچر دیتے تھے۔ اس سلسلے کی آخری کڑیوں میں مجاز ہیں۔

دوسرے، مجاز کا ذخیرہ الفاظ اور معنویت کے لحاظ سے لفظوں کا انتخاب۔ ایسا انتخاب کہ دوسرے شاعروں نے بالکل وہی بات کہی مگر اتنے مکمل diction کے ساتھ نہیں کہہ سکے۔ مجاز کی یہ لفظیات ہر مصرعے کے حسن کو کئی گنا بڑھا دیتی ہے۔ تیسرے، فکر کی بلندی اور مکمل آزادی۔ انہوں نے وقت کے مسائل کو عموماً دوسرے ترقی پسند شاعروں، ادیبوں کی طرح لیا مگر ان پر اپنی انفرادی فکر کی چھاپ چھوڑی۔ نظم ''خانہ بدوش'' میں اس کی مثال ملتی ہے جس میں زمانے کے ستائے ہوئے انسان کی زندگی اور کردار کی مکمل تصویر کشی ہے لیکن دوسرا پہلو بھی ہے:

پیسہ اگر ملے تو حمیت بھی بیچ دیں
روٹی کا آسرا ہو تو عزت بھی بیچ دیں

ان کی اس قسم کی حقیقت بیانی اور صاف گوئی، فکری آزادی کا صرف ایک جز ہے۔ چوتھی خصوصیت جو مجاز کی شاعری کے معمولی بلکہ قلیل حجم کو صفاتی لحاظ سے بھاری بھرکم بناتی ہے یہ ہے کہ انہوں نے شاعری اور مجموعی طور سے ادب کو نئے تصورات دیے۔ ''رات اور ریل'' گویا نت نئے تصورات اور شبیہوں کا ایک سیل رواں ہے۔ دوسری طرف اس میں صنعتی انقلاب کی طوفانی کیفیت اور اس کے اچھے برے پہلوؤں کی، ساتھ ہی حقیقی انقلاب، دونوں کی ہیجان خیزی کے علاوہ اپنے ذاتی واردات کی تصویر کشی نظر آتی ہے۔ ''کس سے محبت ہے'' میں عورت کا ایک بالکل نیا اور انوکھا تصور ملتا ہے۔ وہ اسی دنیا کی down to earth قسم کی عورت ہے پھر بھی بے حد غیر معمولی اور منفرد۔ اس بارے میں عصمت چغتائی کا تبصرہ چشم کشا ہونے کے علاوہ بے حد دلچسپ بھی ہے۔ سوال یہ بھی کیا گیا کہ کیا ایسی خاتون کا کوئی وجود نہیں تھا، یہ عورت صرف ان کے تصور میں تھی؟ ''آوارہ'' اور دوسری متعدد نظموں میں ایسی تازہ شبیہیں اور تصورات موجود ہیں۔ ان چاروں میں سے ہر خصوصیت ان کے کلام میں اتنی نمایاں اور حاوی معلوم ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو سب سے اوپر رکھا جائے اور بعد کی ترتیب میں کیا نمبر ہو۔

نئی تخیل اور تصورات، رواں زبان اور اپنی منفرد لفظیات کے ذریعہ مجاز نے اردو شاعری کی تزئین کی تو دوسری طرف ان نئے تصورات و دیگر خاصیتوں کے ذریعہ انہوں نے شاعری میں نئی معنویت بھی پیدا کی۔ یہ معنویت زندگی کے عصری مظاہر کو اپنے مخصوص تخلیقی انداز میں دیکھنے سے بھی پیدا ہوئی اور اپنے واردات قلب کے بیان نیز جمالیات کی منظر کشی سے بھی۔ دونوں کی مثالوں کا تقریباً لامتناہی سلسلہ ذہن میں آتا ہے۔ بہر حال دو یہاں پیش کی جارہی ہیں۔ ان میں سے ایک ''خانہ بدوش''، خصوصاً اس کا یہ بند عصری مظاہر میں ان کی تخلیقی نظر اور گہری فکر کا نمونہ ہے:

ماتھے پہ سخت کوشیٔ پیہم کی داستاں
آنکھوں میں حزن و یاس کی گھنگھور بدلیاں

چہروں پہ تازیانۂ افلاس کے نشاں
ہر ہر ادا سے بھوک کی بیتابیاں عیاں

دوسری مثال جو جمالیات منظر کشی کی ہے ''نمائش میں'' کے ان اشعار میں ملتی ہے، بالکل برعکس موضوع پر:

چمک تاروں کی چشم سرگیں میں
جھلک چاندی کی جسم مرمریں پر
وہ خوشبو آ رہی ہے پیرہن سے
فضا ہے دور تک جس سے معطر

--

کوئی آئینہ دار حسن فارس
کسی میں حسن یونانی کے جوہر
یہ اپنے حسن میں عذرائے وامق
وہ اپنے ناز میں سلمائے اختر
وہ تابانی میں خورشید درخشاں
وہ رعنائی میں اس سے بھی فزوں تر

--

خرام ناز سے نغمے جگاتی
وہ چل دیں ایک جانب مسکرا کر
کسی کی حسرتیں پامال کرتی
کسی کی حسرتیں ہمراہ لے کر

ایک ہی قافیے میں عین اسی پائے کے ۲۶/اشعار ہیں۔

مجاز کی مقصدیت دوسروں کے ساتھ مشترک بھی ہے اور ان کی اپنی مقصدیت بھی جو مذکورہ چاروں صفات میں ظاہر ہوتی ہے۔ شاعری ان کے نزدیک نہ تو رواروی کا عمل ہے اور نہ اپنی تسکین، نہ اپنے کو نمایاں کرنے کا ذریعہ۔ شاعری کی تزئین و آرائش، اس کے ہر لفظ میں معنویت پیدا کرنا اور تخلیقی سعی میں اپنی انفرادی مقصدیت... یہ ہے مجاز کی فکرِ سخن۔

سراج اجملی

مجاز کی غزل

ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ غزل گو شعرا کی جو فہرست تیار ہوتی ہے اس میں پہلا نام اسرار الحق مجاز کا ہے۔ مجاز کی شاعری کا آغاز ترقی پسند ادبی تحریک کی داغ بیل پڑنے سے پہلے ہو چکا تھا لیکن جس طرح اس تحریک کے ذریعے پیش کی گئی اقدار اور نظریات کا لاوا عرصے سے ذہنوں میں پک رہا تھا اور ملکی و عالمی سطح پر جو تغیرات رونما ہو رہے تھے، سماج میں جس طرح کی تبدیلیاں آ رہی تھیں اور حساس اذہان و ذہین افراد جس طرح ان سے متاثر ہو رہے تھے، بالکل اسی طرح مجاز بھی روز اول سے ہی ان خیالات و نظریات سے کہیں نہ کہیں وابستہ ضرور تھے۔ مجاز کی رومانی عناصر سے وابستگی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ان کے بیشتر نقادوں نے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ دراصل رومانیت مجاز کی شاعری کی روح کا حکم رکھتی ہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستگی بھی بہ تمام و کمال اس رومانیت پر اثر انداز نہیں ہو پائی اور یہی چیز مجاز کی شاعری کا خاصہ ہے اس کی جانب اکثر ناقدین نے اشارہ کیا ہے، سردار جعفری نے مجاز کے رومان کو انقلابی مزاج کا رومان کہا ہے

اور وضاحت سے لکھا ہے کہ ''ہم رومانی کہہ کر مجاز کی اہمیت کو کم نہیں کر سکتے''۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ مجاز کا رومان انقلابی مزاج کا حامل تھا۔ اس بات کا ثبوت آہنگ کے صفحات پر جگہ جگہ ملتا ہے۔ ترقی پسند ادبی تحریک کے شروع کے دنوں کے تقریباً تمام شعرا پر اور بطور خاص غزل گویوں پر رومانیت کا اچھا خاصا اثر ملتا ہے۔ جہاں تک بات انقلابی مزاج کے رومان کی ہے تو وہ بھی اس دور کے تقاضے کے عین مطابق تھا کیونکہ مجاز کی شخصیت کی تشکیل بطور شاعر جس ماحول میں ہوئی وہ رومانیت سے متاثر ماحول تھا اور بطور شاعر مجاز کے، اپنی حیثیت کو تسلیم کروا لینے کے بعد شاعری کا جو سب سے قوی رجحان تھا وہ انقلاب آزادی قومیت وغیرہ سے عبارت تھا۔ اس شاعر خوش فکر کو ان دونوں رجحانات سے بحسن و خوبی عہدہ برا ہونا تھا سو اس نے اس مطالبہ کو نبھایا اور فیض کے لفظوں میں ''انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں مطرب'' کہلایا۔

کسی بھی تحریک یا رجحان کے آغاز میں اس سے وابستہ لوگوں میں ایک خاص قسم کا جوش یا واضح قسم کی شدت کا پایا جانا عام بات ہے اور ترقی پسند ادبی تحریک میں یہ عام بات خاص طور پر محسوس کی جا سکتی ہے یا محسوس کی جاتی رہی ہے۔ مجاز کا تعلق تحریک کے بنیاد گزار شاعروں کی صف سے ہے لیکن اس کا امتیازی وصف ہی یہ نظر آتا ہے کہ اس نے اپنے لہجے کی نرمی اور اظہار کے والہانہ پن کے پردے میں اس عمومی شدت کو چھپا دیا۔ ایسا نہیں ہے کہ مجاز کا رویہ زندگی اور لوازمات زندگی کے تئیں کہیں بھی غیر ترقی پسندانہ رہا ہے۔ ترقی پسند نقطۂ نظر روز اول سے ہی مجاز کی فکر کا حصہ رہا ہے۔ اس نے زندگی اور مطالبات زندگی کا معروضی انداز میں مشاہدہ کیا اور اظہار بھی کیا۔ ترقی پسند نصاب کے عین مطابق وہ بھی رسوم و رواج اور فرسودہ قدروں کی بندشوں میں سانس لینا اس انسان کے لیے مناسب نہیں سمجھتا جسے آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ اردو شاعری کے عاشق کے کلاسیکی تصور کے بالمقابل مجاز کے یہاں عاشق نشاط و طرب کے نغمے بکھیرتا نظر آتا ہے۔

وہ زندگی کے مثبت پہلوؤں پر یقین رکھتا ہے۔ محزونی مایوسی نامرادی وغیرہ کے بالمقابل امید طرب اور کامیابی و نشاط وغیرہ کے نغمے گاتا ہے لیکن ایسے ماحول میں بھی انقلاب کی جدوجہد کا خیال اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا اور وہ اس عمل میں معاشرے کے ہر طبقے اور ہر صنف کو ساتھ لے کر چلنا چاہتا ہے۔ منظر سلیم کے بقول ''ترقی پسند شاعروں نے محبوبہ کے اس رول پر 'اٹھ میری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے'' کہتے ہوئے جو زور دیا ہے اس کا ابتدائی تصور مجاز کا ہی دیا ہوا ہے''۔

مجاز کی شاعری میں عورت رمحبوبہ کا خالص ترقی پسند تصور ملتا ہے۔ وہ پس پردہ رہنے والی محبوبۂ دل نواز یا نازک اندام حسینہ نہیں بلکہ محبوب کے ساتھ سرد و گرم زمانہ سے نبرد آزما رفیق و ہم سفر ہے۔ اسے کسی بھی طرح دوسرے درجے کی مخلوق نہیں گردانا جا سکتا۔ شاعر کو زندگی کے سفر میں جو مشکلات درپیش ہیں ان سے نبرد آزمائی کے لیے اسے جس طرح کی رفاقت چاہیے، محبوبہ سے وہ ایسی ہی رفاقت کا مطالبہ کرتا ہے۔ جس دور میں مجاز کی شاعری میں عورت سے برابری کا مطالبہ یا برتاؤ نظر آتا ہے معاشرے میں شاید ممکن ہی نہ تھا۔ علی گڑھ جہاں مجاز نے اپنے بہترین دن گذارے ہیں اور جہاں بطور خاص اس کا فکری ارتقا ہوا ہے وہاں پردے کا سخت رواج تھا۔ ایسے ماحول میں مجاز اپنی شاعری میں عورت سے اس طرح کے مطالبات کرتا ہوا نظر آتا ہے جو اس کی دوراندیشی اور شاعرانہ بصیرت پر دلالت کرتے ہیں۔ سردار جعفری اور دوسرے ترقی پسند ناقدوں نے مجاز کے اس رویے کی بجا طور داد دی ہے۔

مجاز کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنے والے واقف ہیں کہ اس کی زندگی ناکامیوں اور محرومیوں سے عبارت ہے۔ اطمینان اور آسودگی کا وقفہ اس کے پورے عرصۂ حیات میں کم سے کم نظر آتا ہے بلکہ معدوم ہے لیکن اس کے باوجود، مایوسی یا قنوطیت اس کی شاعری کا غالب محاورہ نہیں بن پاتی اگرچہ اس کیفیت کے تمام اسباب بشمول رفاقت فانی

بدایونی مجاز کو میسر رہے۔ ذاتی زندگی کے مسائل کے عکس سے متاثر شاعری کے مقابلے ایک نوع کی انفرادیت، آواز استحکام اور پائدار انداز کی شاعری مجاز کا طرۂ امتیاز ہے۔

بہ ایں سیل غم و سیل حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

گویا تمام تر زحمتوں اور قدم قدم پر محرومیوں کا سامنا کرنے کے باوجود مجاز نے اپنی شان کج کلاہی قائم رکھی اور جھکنا تو اسے آتا ہی نہ تھا۔ درپیش حالات سے مسلسل نبرد آزمائی اور اپنے خوب صورت شعری پیرایئے میں ان حالات پر ردعمل جنہوں نے اسے اور اس جیسے لاکھوں جوانوں کو وہ سب کچھ حاصل نہ کرنے دیا جو وہ چاہتا تھا، اس کے ترقی پسند طرز فکر سے غیر معمولی وابستگی کی دلیل ہے۔ اس کے باوجود مطالبات فن کا دامن کہیں بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹتا نظر نہیں آتا اور شعر مجاز تمام تر ترقی پسندی کے باوجود شعر بھی رہتا ہے۔

مجاز کی غزل میں کسی نئے تجربے کا کوئی نشان نہیں ملتا اس نے روایتی انداز اور لفظیات کا ہی استعمال کیا، لیکن اپنی فنکارانہ صلاحیت سے اپنی غزل کے ابعاد کو روشن اور شخصیت و شاعری کی دوئی کو مٹا کر غزلوں میں اپنی انفرادیت قائم کر دی۔

پروفیسر عتیق اللہ کے بقول:

> ''مجاز کی غزل کے مفاہیم اور لفظیات ایک دوسرے میں ضم ہو گئے ہیں اس لیے تجربے کی علاحدگی کے الزام سے مجاز کی غزل بری ہے، مجاز نے جس منطقی تطابق کی بنیاد پر اپنی شخصیت اور غزل کو ایک اکائی میں ضم کر دیا ہے اور روایت کے جس وسیلے سے اپنے لمحاتی بلکہ ہنگامی تاثرات سے ہیجانیت کو چھانٹ کر تجربے کی تطہیر کی ہے اگر یہ عمل ان کی نظموں میں بار پاتا اور خود

اسی عمل کے تحت کچھ اور بھی غزلیں کہی ہوتیں تو مجاز کا مایہ آج
ہمارے سامنے قطعی مختلف صورت میں ہوتا، تاہم ان کی موجود
غزلوں میں بلا کی توانائی اور قوت موجود ہے''۔

روایت کے وسیلے سے تجربے کی تطہیر واقعتاً مجاز کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔اردو غزل کے عام مزاج کے برخلاف مجاز نے بلندی افکار اور رفعت خیال کے اظہار کے لیے برائے شعر گفتن سب سے آزمودہ موضوع تصوف کا سہارا نہیں لیا بلکہ مادی حیثیت سے معاملات و روابط پر غور کیا اور نتیجے کے طور پر وجود میں آنے والی شاعری کو آہنگ کے صفحات کی زینت بنایا ہے۔

دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طراز شوق
لے سر اٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم
ہم کو رسوا نہ کر زمانے میں
بسکہ تیرا ہی مزار ہیں ہم لوگ
اذن خرام لیتے ہوئے آسماں سے ہم
ہٹ کر چلے ہیں رہ گذر کارواں سے ہم
بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جراتیں مجاز
ڈرتے نہیں سیاست اہل جہاں سے ہم

عطا کیا ہے مجاز فطرت نے وہ مذاق لطیف ہم کو
کہ عالم آب و گل سے ہٹ کر اک اور عالم بنا رہے ہیں

بہ ایں سیل غم و سیل حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے
بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں

یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے
بتانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل
ہزار بار جہاں سے گذر چکا ہوں میں

یہ اشعار اور ایسے ہی متعدد اشعار کے ذریعہ مجاز جس کیفیت کو پیش کرنا چاہتا ہے اس کا تعلق مجاز کے عصر سے اور اس فکر سے بہت گہرا ہے جسے ترقی پسند فکر کہا جاتا ہے۔ مجاز نے اظہار کے ہنگام میں جو طریقۂ کار اپنایا ہے اس کا رشتہ روایتی کلاسیکی اظہار سے خاصا قوی ہوتے ہوئے بھی تقریباً ہر بیت یا ہر مصرعے میں کچھ منفرد ضرور نظر آتا ہے۔ ان اشعار میں اپنی الگ ڈگر بنانے یا ڈگر سے ہٹ کر چلنے، جرأت و بے خوفی کے مظاہرے، اپنے مذاق لطیف پر غیر معمولی بھروسہ کرنے اور اس عالم آب وگل کے بالمقابل ایک نیا عالم تخلیق کرنے کا حوصلہ رکھنے، دنیا کو دارالمحن اور دارالامتحان کے بجائے دارالسرور قرار دینے اور ہجوم افکار و سیل غم واندوہ میں بھی مستقل مزاجی کا مظاہرہ کرنے کا جو انداز ہے وہ مجاز کے اظہار کو انفرادیت عطا کرتا ہے۔ مجاز اور اس کے معاصرین خصوصاً جذبی کو تلاش و جستجوئے منزل خود منزل کے مقابلے کہیں زیادہ عزیز ہے۔ اس خیال میں سفر کا جو غیر مختتم سلسلہ نظر آتا ہے، تلاش و تفحص سے جو غیر معمولی رغبت دکھائی دیتی ہے وہ شاعر کی انفرادیت پر دال ہے۔

بتانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل
ہزار بار جہاں سے گذر چکا ہوں میں

--

اللہ ری بے خودی کہ چلا جا رہا ہوں میں
منزل کو دیکھتا ہوا کچھ سوچتا ہوا

(جذبی)

ان دونوں اشعار کا متکلم گم کردہ راہی کا شکار نہیں ہے بلکہ اپنے افکار میں غلطاں ہونے کے سبب سے اور حصول منزل کی طلب میں اس درجہ وارفتہ ہے کہ خود منزل بھی سامنے ہو تو گذر جائے۔ وہ منزل نہیں بلکہ حقیقت منزل کا متلاشی نظر آتا اور روح مقصد تک پہنچنے کی جستجو اسے آوارہ مزاجی اور بے پروائی کی دولت سے بہرہ ور کرتی ہے۔

مجاز کی شاعری اگر چہ ترقی پسند ادبی تحریک کے اولین دور میں وجود میں آئی اور اس دور میں غزل کے پیرائے میں ترقی پسند اظہار کے خدوخال مکمل طور پر مرتب نہیں ہوئے تھے اس کے باوجود مجاز کے اظہار میں وہ تمام آثار نظر آتے ہیں جو تکمیل کے عمل سے گذر کر مجروح جیسے غزل گو شعرا کے اظہار کا خاکہ متصور کیے جا سکتے ہیں۔

راشد انور راشد

مجاز بحیثیت ترقی پسند شاعر

جذباتی وابستگی اور والہانہ عقیدت کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ منطقی اور استدلالی طریقۂ کار کے ذریعے ہی تنقید کا وقار قائم ہوسکتا ہے۔ ہم بہت آسانی کے ساتھ کسی بھی شاعر و ادیب کے متعلق ادبی فتوے صادر کر دیتے ہیں کہ اسے ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی، یا اسے وہ مقام نہیں دیا گیا جس کا وہ مستحق تھا وغیرہ وغیرہ۔ یہ رویہ تنقید کے شایانِ شان نہیں۔ ہمیں مدلل گفتگو کی راہ ہموار کرنی چاہیئے تا کہ فن کار کی اہمیت کو صحیح تناظر میں پرکھا جاسکے۔ جن فن کاروں کی ادبی اہمیت کو پرکھنے کے دوران جذباتی وابستگی اور والہانہ عقیدت اکثر آڑے آتی رہی ہے۔ انہیں قدرے مدلل انداز میں پرکھنے کی ضرورت ہے تا کہ حقیقی صورتحال سامنے آسکے۔ اسرار الحق مجاز ایسے ہی فن کار ہیں، جو مستقل طور پر ادبی تذکروں کا حصہ تو رہے، لیکن علیحدہ طور پر ان کی شاعرانہ اہمیت کو گفتگو کا موضوع کم ہی بنایا گیا۔ یہ دونوں باتیں بظاہر متضاد معلوم ہوتی ہیں کہ ایک طرف وہی شاعر، اہم شعراء کی فہرست میں شامل بھی ہو اور دوسری طرف اس کی انفرادیت کو بہت حد تک نظر انداز بھی کیا جائے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ متضاد ہوتے

ہوئے بھی یہ دونوں باتیں اپنی جگہ درست معلوم ہوتی ہیں۔

ترقی پسند شاعروں کی مخصوص فہرست میں بھی مجاز کا ذکر بیشتر نقادوں نے کیا اور ان کی غزلوں کے چند اشعار یا نظموں کے مخصوص ٹکڑے پابندی کے ساتھ حوالے کے طور پر پیش کیے جاتے رہے۔ اس رویّے نے مجاز کی مقبولیت میں یقیناً اضافہ کیا، لیکن انفرادی طور پر جب بھی مجاز کو باقاعدہ طور پر پڑھنے کی کوشش کی گئی تو شخصیت اور شاعری کا طلسم کچھ حد تک ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ مجاز کے متعلق جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ علی گڑھ میں گرلز کالج کی لڑکیاں ان کا مجموعہ اپنے سرہانے رکھ کر سویا کرتی تھیں اور مجاز کی دلہن بننے کا خواب دیکھنے میں مگن رہتی تھیں تو مجاز کی حیرت انگیز مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، لیکن غور کرنے والی بات یہ ہے کہ ''آہنگ'' کا متن اس بات کی تصدیق نہیں کرتا۔ یہاں اس بات کا ذکر غیر مناسب نہیں کہ ''آہنگ'' مجاز کا واحد مجموعۂ کلام ہے جس کے کئی ایڈیشن ان کی زندگی میں ہی شائع ہوئے اور ہر ایڈیشن کو خاطر خواہ سراہا گیا۔ ''آہنگ'' کے ہی آئندہ ایڈیشن ''شب تار'' اور ''سازِ نو'' کے نام سے بھی شائع ہوئے۔

مجاز کے یہاں اچھی اور کامیاب شاعری کے امکانات تو دکھائی دیتے ہیں، لیکن بیشتر اوقات یہ امکانات مختلف جھلکیوں کی صورت میں نگاہوں سے بہت جلد اوجھل بھی ہو جاتے ہیں۔ غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ یہ معاملہ اتنا پیچیدہ بھی نہیں۔ عمر کی جس منزل میں مجاز اپنے شیدائیوں سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوئے، وہی زمانہ دراصل شخصیت کے استحکام میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ فکر اور فن میں پختگی کا سلسلہ بھی تقریباً اسی زمانے میں شروع ہوتا ہے۔ مجاز نے ایک تو مختصر عمر پائی، دوسرے وہ جب تک زندہ رہے، ذہنی اذیتوں سے دوچار رہے۔ ان معنوں میں وہ مواقع انہیں کم ہی ملے جو تخلیقیت کے لیے سازگار ہوتے ہیں۔ پھر بھی مجاز کا شعری سرمایہ اتنا مختصر بھی نہیں کہ اس کے حوالے سے گفتگو کی گنجائش نہ نکل پائے۔

مجاز کی ترقی پسند نظموں میں آوارہ، اندھیری رات کا مسافر، رات اور ریل، نذر خالدہ، ادھر بھی آ، انقلاب، سرمایہ داری، آہنگِ جنوں، مہمان اور خانہ بدوش وغیرہ نظموں کا بہ طور خاص ذکر کیا جاسکتا ہے۔ ابتدا میں ترقی پسند نظریات سے متاثر ہوکر مجاز نے جو نظمیں لکھیں، ان میں آواز کی گھن گرج کو بہ طور خاص محسوس کیا جاسکتا ہے۔ کہیں کہیں ان کی نظموں میں انقلاب کے حوالے سے باغیانہ تیور بھی پوری شدت کے ساتھ اجاگر ہوتے ہیں جس سے ان کی شاعری کی مجموعی اثر آفرینی متاثر بھی ہوئی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

پھونک دو ان کو جھلس دو کہ جلادو ان کو
شانِ شایانِ وطن ہو یہ بتا دو ان کو
یاد ہے تم کو کن اسلاف کی تم یادیں ہو
تم تو خالد کے پسر، بھیم کی اولادیں ہو

(آہنگِ نو)

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے
بتاؤں کیا تمہیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے
یہ وہ آندھی ہے جس کی رو میں مفلس کا نشیمن ہے
یہ وہ بجلی ہے جس کی زد میں ہر دہقاں کا خرمن ہے
یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے

(سرمایہ داری)

لیکن جلد ہی مجاز کو اپنے لہجے کے بکھراؤ کا اندازہ ہوگیا اور انہوں نے اپنی شاعری کو شدت پسندی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ جن نظموں میں مجاز نے ترقی پسند ادب کے ضابطوں اور اصولوں کو زیادہ اہمیت دینے کی کوشش کی، وہاں ان کی شاعری، خیال کی

نزاکت کے بجائے بیان کی برجستگی سے عبارت ہو کر رہ گئی۔ لیکن جہاں کہیں انہوں نے اپنی شاعری کو محض آلہ کار بنانے سے گریز کیا، وہاں بہتر شاعری کے نمونے سامنے آئے ہیں۔ شاعری سے زندگی کو بنانے اور سنوارنے کا کام لیا جا سکتا ہے، لیکن ادبی تقاضوں کی اولیت بنیادی شرط ہے۔ مجاز نے اپنی بعض نظموں میں ادبی تقاضوں کو نہ صرف پیش نگاہ رکھا ہے بلکہ اسے بہتر طریقے سے برتنے کی کوشش کی بھی ہے۔

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پہلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ، جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

(آوارہ)

افق پر زندگی کے لشکر ظلمت کا ڈیرا ہے
حوادث کے قیامت خیز طوفانوں نے گھیرا ہے
جہاں تک دیکھ سکتا ہوں، اندھیرا ہی اندھیرا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

(اندھیری رات کا مسافر)

مجاز کی کئی نظموں میں غزل کا انداز غالب ہے، جو ترقی پسند نظم کو مجاز کی ایک اہم دین ہے۔ بعض موضوعات سلسلے وار بیان کے متقاضی ہوتے ہیں۔ ایسی نظموں میں اگر تین چار مصرعوں کے بعد ٹیپ کا مصرعہ دہرایا جاتا ہے تو نظم کی روانی متاثر ہوتی ہے۔ مجاز کے یہاں ایسی کئی نظموں کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جن میں ٹیپ کا مصرعہ نبھانے کے لیے فضا بندی کی گئی ہے۔ اس کا ایک منفی پہلو یہ ہے کہ تاثر قائم ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر نظم ''مجھے جانا ہے اک دن'' کے یہ ٹکڑے ملاحظہ ہوں:

ابھی ہیں شہر کی تاریک گلیاں منتظر میری
ابھی ہے اک حسیں تحریک طوفاں منتظر میری
ابھی شاید ہے اک زنجیر زنداں منتظر میری
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو فاقہ کش انسان سے آنکھیں ملانا ہے
ابھی جھلسے ہوئے چہروں پہ اشک خوں بہانا ہے
ابھی پامال جور آدم کو سینے سے لگانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزم ناز سے آخر

یہ اور کئی دوسری نظمیں اس بات کا تقاضہ کرتی ہیں کہ روانی کے ساتھ خیالات کی ترسیل ہونی چاہیے تھی اور اگر ایسا ہوتا تو نظمیں زیادہ کامیاب ہوتیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مجاز کی سب سے مقبول نظم ''آوارہ'' میں ٹیپ کا مصرعہ غضب کا تاثر قائم کرتا ہے۔ غالباً مجاز نے غزلیہ انداز کا سہارا لے کر اپنی کئی نظموں میں تسلسل بیان کی کمی کو دور کرنے کی کوشش کی تھی۔ غزلیہ انداز کا ایک بڑا فائدہ تو یہ ہے کہ اشاریت اور ایمائیت کے سہارے خیالات کی ترسیل ہو جاتی ہے اور اگر پوری نظم کسی کے ذہن میں نہ بھی ہو تو نظم کے چند مصرعے غزل کے شعر کی طرح حافظے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مجاز کی کئی نظموں میں یہ پہلو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

جو ہو سکے ہمیں پامال کر کے آگے بڑھ
نہ ہو سکے تو ہمارا جواب پیدا کر

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

خیر مقدم کو مرے کوئی یہ ہنگام سحر
اپنی آنکھوں میں لیے شب کا خمار آ ہی گیا
کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

یہ اشعار بظاہر غزل کے اشعار معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہ نظموں کے اشعار ہیں، جو غزلیہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ مجاز نے اس انداز کی بدولت ترقی پسند شاعروں میں بہرحال اپنی انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔

مجاز کا شعری کمال انقلابی نظموں میں اپنا خاص جوہر دکھاتا ہے۔ اس نوع کی نظموں میں ان کی تخلیقی ہنرمندی زیادہ فن کاری کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے۔ انقلابی تصور کو پیش کرتے ہوئے انہوں نے جن نظموں کی تخلیق کی ہے۔ ان میں غضب کی انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ ابتدا میں ان کے یہاں انقلابی تصور کو پیش کرنے کے دوران جذبات سے مغلوب نعرے بازی کا احساس بھی ہوتا ہے، لیکن بعد میں انہوں نے اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی اور انقلابی تصور میں رومان کا پہلو شامل کر کے نظموں میں غنائی حسن شامل کرنے میں کامیاب رہے:

اس گل کدۂ پارینہ میں پھر آگ بھڑکنے والی ہے
پھر ابر گرجنے والے ہیں، پھر برق کڑکنے والی ہے
جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا، ہر کوہِ گراں پر برسے گا
ہر سرو و سمن پر برسے گا، ہر دشت و دمن پر برسے گا
خود اپنے چمن پر برسے گا، غیروں کے چمن پر برسے گا
ہر شہر طرب پر گرجے گا، ہر قصر طرب پر کڑکے گا

یہ ابر ہمیشہ برسا ہے، یہ ابر ہمیشہ برسے گا

(نذر علی گڑھ)

دیکھ بدلا نظر آتا ہے گلستاں کا سماں
ساغر و ساز نہ لے، جنگ کے نعرے میں یہاں
یہ دعائیں ہیں وہ مظلوم کی آہوں کا دھواں
مائل جنگ نظر آتا ہے ہر مرد جواں
سرفروشان بلاکش کا سہارا بن جا
اٹھ اور افلاک بغاوت کا ستارا بن جا

(ایک جلاوطن کی واپسی)

مجاز کی کئی نظموں میں ہر چند کہ انقلاب کی گونج واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے، لیکن انہوں نے جلد ہی انقلابی موضوعات کو بھی لہجے کی غنائیت سے انفرادیت بخش دی۔ بہت سے ناقدوں نے اس نکتے کو اجاگر کیا ہے اور درست کیا ہے کہ مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں، بلکہ مطرب ہے۔ مجاز کی شاعری سطحی طور پر ہمارے جذبات کو برانگیختہ نہیں کرتی بلکہ ہمارے سوئے ہوئے ضمیر کو بیدار کرتی ہے اور بڑے سلیقے سے ہمارے عزم، جوش اور ولولے کو ایک خاص نہج پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دیتی ہے۔ مجاز کی شاعری ایک آئیڈیل معاشرے کے قیام کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ خود مجاز اپنی شاعری کے ذریعے اس بات کی شعوری کوشش کرتے ہیں کہ آنکھوں میں پلنے والے سنہرے خواب کسی طرح خوب صورت فقروں سے ہم کنار ہو جائیں۔ بڑی اور معیاری شاعری کی کسوٹی پر اگر مجاز کی شاعری کو پرکھنے کی کوشش کی جائے تو بلاشبہ ہمیں کامیابی نہیں ملے گی، لیکن ایک محدود دائرے میں رہتے ہوئے بھی مجاز نے اردو نظم کو جو انفرادیت بخشی اس کا اعتراف ان کے مخالفین بھی کرتے ہیں۔

سرورالہدیٰ

مجاز تنقید کے چند حوالے

مجاز پر لکھی جانے والی تنقید کا بڑا حصہ مجاز کی شخصیت سے متعلق ہے۔ مجاز کے انتقال کو نصف صدی سے زائد کا عرصہ بیت گیا ہے مگر مجاز تنقید مجاز کی شخصیت سے فاصلہ قائم نہیں کر سکی، اگر مجاز کی شخصیت مجاز کے شعری متن پر آج بھی حاوی نظر آتی ہے تو اس کے ذمہ دار مجاز کے نقاد بھی ہیں۔ ہمارے بیشتر نقادوں نے مجاز کی شخصیت کو موضوع بنا کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مجاز کا شعری متن کمزور ہے لہٰذا میری پریشانی کا سبب مجاز کے وہ نقاد ہیں جو مجاز کی شخصیت کے سحر سے خود کو نکال نہیں سکے۔ ہمارے عہد کے کسی نقاد نے کبھی کہا تھا کہ مجاز ہی شاعر نہیں ہیں۔ یہ ایک دوسری انتہا پسندی تھی اس قسم کے جملے کسی شعری متن کو نہ تو کمزور کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی طرف سے توجہ ہٹا سکتے ہیں۔ آج جب ہم مجاز کی یاد میں یہاں جمع ہوئے ہیں تو یہ بات واقعی افسوسناک ہے کہ مجاز کا شعری متن مجاز تنقید میں مرکزی حیثیت اختیار نہیں کر سکا۔ میری نظر میں آج مجاز کی شخصیت پر گفتگو کرنا سہل پسندی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مجاز کو ایک افسانوی کردار بنا کر بہت دنوں تک ادب کے سنجیدہ

حلقے میں بامعنی ثابت نہیں کیا جا سکتا، اگر کسی نے کہا تھا کہ مجاز شاعر ہی نہیں تھے تو لازماً ان کے کچھ تعصبات ہوں گے۔ کبھی کبھی حد سے بڑھی ہوئی علمیت اور ذہانت کا غرور انسان کو مضحکہ خیز بھی بنا دیتا ہے۔ کم و بیش پچاس سال سے مجاز کا نام کچھ لوگ صرف اس لیے کاٹ رہے ہیں کہ مجاز ترقی پسند تھا۔ کبھی کبھی تو محسوس ہوتا ہے کہ مجاز کا متن توجہ کے ساتھ نہیں پڑھا گیا، ایسا نہیں، بس ایک بات ذہن میں اٹک گئی تو اٹک گئی۔

مجاز کے انتقال کے بعد شاہراہ اور علی گڑھ میگزین کے خصوصی نمبر شائع ہوئے۔ یہ دونوں خصوصی شمارے مجاز کے حوالے سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ لیکن ان نمبروں کی بیشتر تحریروں میں مجاز کی شخصیت حاوی ہے۔ ویسے مجاز کے انتقال کے بعد ان تحریروں میں اگر مجاز کے شخصی پہلوؤں کا ذکر نہ ہوتا تو وہ واقعی حیرت کی بات ہوتی۔ حد تو یہ ہے کہ حسن عسکری نے بھی مجاز کے انتقال پر جو مختصر سا مضمون لکھا تھا اس میں بھی مجاز کی شخصیت حاوی ہے۔ لیکن حسن عسکری نے ڈیڑھ صفحے کے مضمون میں مجاز کی شخصیت اور ان کی تخلیقی صلاحیت دونوں کا اعتراف کیا ہے۔ ان کے مضمون کا عنوان ''مجاز۔ اردو ادب کا افسانہ'' ہے۔ عسکری یہ تحریر اس بات کا علامیہ بھی ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کو رد یا قبول کرنا نہایت ذمہ دارانہ عمل ہے۔ حسن عسکری ترقی پسند نہیں تھے مگر مجاز کی شخصیت سے انہیں ہمدردی تھی۔ بہت دکھ تھا کہ مجاز کی شخصیت نے اپنی شخصیت کو کچھ ایسا بنا لیا کہ ان کی شعری صلاحیت کا خون ہوتا رہا۔ کسی ترقی پسند نقاد نے بھی شاید مجاز کی شخصیت سے اس ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ اگر کہیں اظہار بھی ہوا تو اس میں ان کا مخصوص رویہ زیادہ حاوی ہے۔ حسن عسکری کو جو لوگ اپنا مربی اور قائد تصور کرتے ہیں انہیں مجاز کے تعلق سے حسن عسکری کی یہ مختصر سی تحریر ضرور پڑھنی چاہیے۔ کمال یہ ہے کہ حسن عسکری مجاز کی غزل کے چند اشعار پر مضمون کو ختم کرتے ہیں اور ان شعروں میں انہیں فارسی غزل کا بناؤ، سجاوٹ اور تیکھا پن نظر آتا ہے

اور یہ خوبیاں انہیں مجاز کے عہد میں کم دکھائی دیتی ہیں۔

انہوں نے اپنی شاعری کو بھی ہنسی میں اڑا دیا۔ یہ مجاز کا المیہ ہے۔ ان کی شاعری کو موت نے نہیں بلکہ خود انہوں نے ہم سے چھین لیا... بہر حال مجاز کے یہاں ایک حد تک فارسی غزل کا سا بناؤ سجاوٹ اور تیکھاپن موجود تھا جو نئے ادب میں کمیاب رہا ہے۔ وہ ایک تیور کے ساتھ شعر کہتے تھے۔ کبھی کبھی ان کے شعروں پر ایک مدہوش اور قلندرانہ کج کلاہی کی چھوٹ سی پڑنے لگتی تھی۔

اور کیا چاہیے اب اے دل مجروح تجھے
اس نے دیکھا تو بانداز دگر آج کی رات
اللہ اللہ وہ پیشانی سیمیں کا جمال
رہ گئی جم کے ستاروں کی نظر آج کی رات
نغمہ و مے کا یہ طوفان طرب کیا کہیے
گھر مرا بن گیا خیام کا گھر آج کی رات

حسن عسکری نے اخیر میں ایک اور ایسی بات لکھ دی ہے جس سے ان کی کشادہ ذہنی اور متن کو متن کی شرطوں پر پڑھنے کی تحریک ملتی ہے۔ ''ان دو تین نظموں کی بدولت مجاز ادبی تاریخ تو الگ رہی ہماری سماجی تاریخ میں داخل ہو چکے ہیں۔ مجاز اپنے پیچھے ایک افسانہ چھوڑ گئے ہیں جو آسانی سے نہیں مرے گا۔''

حسن عسکری نے پیشن گوئی کی تھی کہ مجاز کا افسانوی کردار بہت آسانی سے نہیں مرے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ تو یہ افسانہ مرا ہے اور نہ مجاز کی شاعری کا معنوی سفر ختم ہوا ہے۔ حسن عسکری کو اگر یہ اشعار اچھے لگے تو اس کی وجہ مجاز کی ترقی پسند یا رومانوی فکر نہیں تھی ان

شعروں میں وہ سریت بھی نہیں ہے جسے لوگ مجاز کے یہاں تلاش کرتے رہے ہیں اور نہ ملنے کی صورت میں مجاز کی شاعری کو تیسرے اور چوتھے درجے کی شاعری قرار دیا۔ اے غم دل کیا کروں والی نظم کو انہوں نے ادبی تاریخ کے ساتھ سماجی تاریخ کا حصہ بتایا ہے۔ یہ جملہ اس بات کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ مجاز کی یہ نظم اپنے سماجی سروکار کے ساتھ ساتھ ادبی تقاضوں کو بھی بڑی حد تک پورا کرتی ہے۔ حسن عسکری نے اس نظم کے حوالے سے سماجی تاریخ کا جو فقرہ استعمال کیا ہے وہ مابعد جدید تنقید سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ فراق نے شاہراہ کے مجاز نمبر میں ''باتیں'' کے عنوان سے مجاز کی شخصیت کو زیادہ موضوع گفتگو بنایا مگر یہ گفتگو انہیں مجاز کی نظموں کی طرف بھی لے جاتی ہے۔ وہ جب مجاز کی نظم کو کسی جوالا مکھی یا شعلے کا نام دیتے ہیں تو ایسے میں مجاز کی شخصیت ان نظموں سے فطری طور پر قریب ہو جاتی ہے۔ مجاز کی دو نظموں کو وہ ترقی پسند شاعری کا اعلان بتاتے ہیں اور ان کے لیے گھڑ گھڑاہٹ، جمود شکن، جیسے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''مجاز کی ان نظموں کو پڑھ کر اجتماعی زندگی کا Tempo بڑھ جاتا تھا۔ یہ آواز قومی زندگی کی تقدیر کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ وہ تقدیر جو یکا یک جاگ اٹھی تھی۔'' ان نظموں کے تعلق سے فراق اور حسن عسکری کی رائے ایک جیسی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ فراق، مجاز کے تعلق سے جذباتیت کے شکار ہو جاتے ہیں۔ فراق کی اس تحریر کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ وہ مجاز کی شخصیت کو مجاز کے شعری متن کے ساتھ رکھ کر دیکھتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجاز کی شاعری مجاز کی شخصیت سے الگ نہیں ہے۔ ''یہ نظم مجاز کے اندر چھپی ہوئی اس آگ کا پتہ دیتی تھی جو شاعر کو ایک دن پھونک کر رکھ دے گی۔''

مجنوں گورکھپوری نے مجاز کے لیے بڑا شاعر، معصوم ہستی جیسا بولتا ہوا عنوان قائم کیا مگر وہ مجاز کو بڑا شاعر ثابت نہیں کر سکے۔ سارا ذکر مجاز کی معصوم ہستی تک محدود ہے۔ وہ مجاز کی شاعری کو روایت کے زندہ عناصر اور عصریت کی حامل بتاتے ہیں۔ وہ بار بار یہ کہتے

ہیں کہ مجاز پر پھر بھی لکھوں گا لیکن وہ خود ہی سوال قائم کرتے ہیں ''مجاز کی اس بلندی کا راز کیا ہے''۔ اور اس سلسلے میں جو باتیں لکھتے ہیں وہ کسی بھی شاعر کے لیے لکھی جا سکتی ہیں۔ اس مضمون کا وہ حصہ اہم ہے جس میں لکھنؤ کے ایک مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں مجاز نے انہیں یہ شعر سنائے تھے۔

کیا ہوا میں نے اگر ہاتھ بڑھانا چاہا
آپ نے خود بھی تو دامن نہ بچانا چاہا
یوں تو افسانۂ الفت تھا ازل سے رنگیں
میں نے کچھ اور بھی رنگین بنانا چاہا

ممتاز حسین نے اپنے مضمون کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ'' میں مجاز کے تعلق سے بہت فکر انگیز اور معروضی گفتگو کی ہے اس وقت تک کسی ترقی پسند نقاد نے مجاز کی شاعری کو اس طرح نہیں دیکھا، انہیں مجاز کی رومانی اور انقلابی فکر عزیز ہے وہ ان افکار اور مسائل کو اس عہد کی سماجی اور سیاسی زندگی کے سیاق میں بھی دیکھتے ہیں مگر انہیں شعریت کا بھی بڑا لحاظ ہے۔ وہ اس حد تک لکھ جاتے ہیں کہ:

''اس کے انقلابی شعور کی سطح روش عام کے مطابق سطحی تھی۔ وہی نوجوانوں سے خطاب کرنے کا رنگ اور وہی قدیم خطابت۔ اس اعتبار سے مجاز کی وہ شاعری وقیع نہیں۔ تاہم اس کی شاعری میں وہ شعریت موجود ہے جو سوز و گداز لطف بیان، الفاظ کے رقص اور موسیقی سے عبارت ہے۔''

ممتاز حسین جیسا صاحب نظر نقاد مجاز کی شاعری کو خالص ادبی نقطہ نظر سے دیکھ سکتا ہے اس نے چند جملوں میں مجاز کے شعری طریقۂ کار کو نشان زد کیا ہے مگر مجاز کی داخلی آگ اور تڑپ زیادہ

بڑی تھی۔ ممتاز حسین نے مجاز کے لیے کچھ ایسے جملے لکھے ہیں جنہیں پڑھ کر آج بھی حرارت کا احساس ہوتا ہے۔

''مجاز نے بھی انقلاب ہی کی ایک شمع جلائی لیکن محسوسات کے فانوس میں نہ کہ اس سے باہر۔ جو لفظ بھی اس کی نوک زباں سے چٹکا وہ موجۂ رنگ و بو سے برافشاں رہا۔ جو نغمہ بھی اس کی شاخ دل سے پھوٹا وہ ایک سیل نور میں غلطاں۔ ظاہر میں نگاہیں دعوت نظر میں کھو گئیں اور اس کی دعوت فکر کو بھول گئیں۔ مجاز کے ساتھ ناانصافی اکثر ہوتی ہے گو مجھے یہ تسلیم ہے اس کی شاعری میں دعوت فکر کم ہے۔ میں یہ کب کہتا ہوں کہ وہ ایک بڑا مفکر تھا.... مجاز کے یہاں فکر کی چاشنی یعنی ذہنی تصویروں پر تجریدی طریق کار کی کمی ہے۔ وہ تشبیہات زیادہ اور استعارات کم استعمال کرتے ہیں حالانکہ دونوں میں فرق تھوڑا ہی سا ہے ان کی ذہانت فقروں رکھ لچکانے کی ہے نہ کہ خیالات کے مرتکز کرنے اور منفرد میں یونیورسل کو دریافت کرنے کی۔''

ممتاز حسین کے اس اقتباس سے واضح ہے کہ شاعری اور اچھی شاعری کے کچھ بنیادی اوصاف کیا ہیں۔ تشبیہات کا استعارات کے مقابلے میں زیادہ استعمال ان کے نزدیک فنی کمزوری نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم ممتاز حسین سے قبل کسی اور نے مجاز کی شاعری میں تشبیہات کی فراوانی کی طرف اشارا کیا یا نہیں۔ ایک عام قاری بھی مجاز کی شاعری سے ان تشبیہات کو یکجا کر سکتا ہے۔ تجریدی طریق کار کی کمی کا انہوں نے اعتراف کیا ہے۔ دراصل یہ وہ شعری وسائل ہیں جن سے شاعری میں دھند کی فضا قایم ہوتی ہے۔ فیض نے'' آہنگ'' کے دیباچے میں مجاز کو انقلاب کا مطرب قرار دیا ہے۔ اور مجاز کو بنیادی طور پر ایک

غنائی شاعر بتایا ہے اور کئی فکر انگیز جملے انہوں نے درج کیے ہیں۔

> مجاز بنیادی طور پر اور طبعاً غنائی شاعر ہے اس کے کلام میں خطیب کے نطق کی کڑک نہیں، باغی کے دل کی آگ نہیں، نغمہ سنج کے گلے کا وفور ہے۔ یہی وفور مجاز کے شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

صاف محسوس ہوتا ہے کہ فیض کی نظر میں مجاز کی آواز بہت منجھی ہوئی اور مترنم آواز ہے یہ نظر خود فیض کی شاعری کی مرہون منت بھی ہے۔ فیض نے اس کے بعد مجاز کے جن شعری نمونوں کو پیش کیا ہے۔ ان میں مجاز کی آواز بہت اونچی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ فیض جسے مجاز کا آہنگ یا موسیقی کہتے ہیں وہ ان کے یہاں یکساں طور پر موجود ہے۔ اس صورت میں نطق کی کڑک باغی کے دل کی آگ کے نہ ہونے کا دعویٰ خود ہی مسترد ہو جاتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''اس کی دھن پھیکی یا اس کے شعر بے سر نہیں ہوئے۔ مجاز کے کلام میں پرانے شعرا کی سہولت اظہار ہے لیکن ان کی جذباتی سطحیت اور محدود خیال نہیں۔ فیض کے اس خیال سے اتفاق مشکل ہے۔ اول تو پرانے شعرا کی شاعری کو سطحی اور محدود خیال نہیں کہا جا سکتا۔ ایک معنی میں مجاز کی شاعری میں ان دونوں باتوں کا اطلاق آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ فیض مجاز کی محبت میں معروضیت سے بہت دور ہو گئے۔ ان کے یہ الفاظ آرائش زبان کے سبب بھی متاثر کرتے ہیں۔

> ''اس کے ترنم میں چاندی کا سا فیاضانہ حسن ہے جس کے پرتو سے تاریک اور روشن چیزیں یکساں دل کش نظر آتی ہیں۔ غنائیت ایک کیمیاوی عمل ہے جس سے معمولی روزمرہ الفاظ عجب پر اسرار پر معنی

صورت اختیار کر لیتے ہیں۔"

فیض نے مجاز کی شاعری میں غنائیت کو یکساں طور پر تلاش کیا ہے اور غنائیت سے روزمرہ کے الفاظ پراسرار اور پر معنی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات وضاحت طلب ہے، غنائیت کسی اچھی شاعری کی خوبی ہو سکتی ہے محض غنائیت سے کوئی شاعری پراسرار نہیں ہو سکتی۔ فیض مجاز کی غنائیت میں فرق نہیں کرتے اگر مجاز کی غنائیت یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں اور ضو فگن روئے حسین پر شب مہتاب شباب دونوں میں یکساں ہے۔ تو واقعی اسے فیض کی فراخدلی کہی جائے گی۔ ظ۔ انصاری نے مجاز کے لیے "اونچی آواز کی سوچ بچار" جیسا عنوان قائم کیا۔ یہ مضمون بھی بڑی حد تک یادداشت پر مشتمل ہے کہیں کہیں مجاز کی شاعری زیر بحث آتی ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ فیض کے علاوہ ظ انصاری بھی مجاز کی شاعری کے لیے تان، سُر غنائیت جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ظ انصاری غنائیت کی وضاحت کرتے ہیں اور حوالے کے طور پر نظموں سے عنوانات بتاتے ہیں۔ وہ ان غنائی نظموں کو فکر انگیز گہرے تجربے کا حامل بھی نہیں بتاتے مگر محسوس ہوتا ہے کہ انہیں لفظوں کا حتا تیاتی نظام متاثر کرتا ہے۔ لیکن ایک مقام پر وہ مجاز کی شاعری کے لیے سیاسی اور فکری رنگ کو ایک ہی معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ عام طور پر مجاز کی سیاسی شاعری کو فکری شاعری کا نام نہیں دیا گیا۔ ظ انصاری کی یہ باتیں مجاز کے تعلق سے ہمدردانہ تو ہیں مگر معروضیت سے خالی نہیں۔ رہا ایسی شاعری کا معاملہ جس کا نمونہ مزدوروں کا گیت، انقلاب، ہمارا جھنڈا یا آہنگ نو ہیں، تو ان نظموں کی بدولت مجاز، تو مجاز بنے اور نہ ان کے کم کر دینے سے مجاز کی نمائندہ شاعری کا کوئی جز کم ہوتا ہے۔ ظ انصاری نے مجاز کی آزادہ روی کو گرفت میں نہ آنے والی روش کا نام دیا ہے۔ ان کی رائے ہے کہ مجاز نے جیسی بھی شاعری کی وہ مجاز کی اپنی افتاد اور شخصیت کا نتیجہ ہے۔ اسے ترقی پسند تحریک نے پیدا نہیں کیا۔ اس ضمن میں وہ جعفر علی خاں اثر کے بارے میں لکھتے ہیں:

انہوں نے مجاز کو جواں مرگ کیٹس سے تشبیہ دی لیکن بھیڑ یوں پر
اسے اٹھالے جانے والے کا الزام رکھ کر انہوں نے صرف اپنے
بغض معاویہ کو تسکین پہنچائی ہوگی۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کا علی گڑھ میگزین کے لیے ایک مضمون ''مجاز کی شاعری میں عورت کا تصور'' جوان کی کتاب میں بھی شامل ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے جس ذمہ داری اور ذہانت کے ساتھ اسے قلم بند کیا ہے اس کی کوئی دوسری مثال اس حوالے سے کہیں نہیں ملتی۔ ابتدا میں انہوں نے مطالعۂ مجاز کی ایک دلچسپ دشواری کی جانب اشارا کیا ہے۔ اس سے محسوس کیا جا سکتا ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے ذہن میں وہ تمام سوالات تھے جن سے مجاز کی شاعری کو آنے والے دنوں میں روبرو ہونا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''مجاز موجودہ دور کا محبوب ترین شاعر تھا۔ اپنے ساتھیوں میں شاید وہی اکیلا شاعر تھا جس کی شاعری سے متعلق دو رائیں نہیں سنی گئیں۔ اس کے کلام میں کچھ ایسی بے ساختگی شادابی اور مہک جسے قبول کر لینے میں کسی قسم کی جھجھک محسوس نہیں ہوتی، دوسروں کو ہم فکر و فن کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں ان کا کھرا اور کھوٹا الگ کرتے ہیں اس شاعری کی تہوں اور پیچیدگیوں کو کھولنے کی کوشش کرتے ہیں اور بار بار الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں لیکن مجاز کی آواز سنتے ہی نہ جانے کیوں گماں گزرتا ہے یہ آواز کہیں اور سے نہیں بلکہ اپنے سینے کے کسی گوشے سے اٹھ رہی ہو۔ اپنی آواز اور اپنے ترنم کا نشہ تنقید کی گرفت میں ذرا مشکل سے آتا ہے۔''

خلیل الرحمٰن اعظمی نے شعوری طور پر مجاز کے شعری طریقہ کار کو موضوع نہیں بنایا۔ آخر کوئی تو بات ہے کہ مجاز کی شاعری اپنے نقادوں سے کچھ مختلف قسم کے مطالبے کرتی ہے۔ اور شعری

طریقہ کار کے مقابلے میں اپنے قوت احساس کو زیادہ طاقت ور بنا کر پیش کرتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اسے اپنی آواز اور اپنا ترنم کہا ہے۔ مجاز کے یہاں عورت کا تصور مجاز کی شاعری ہی میں نہیں بلکہ مجاز کی شخصیت سے بھی گہرا تعلق ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے مجاز کے یہاں انہیں تصور کا زمانی اعتبار سے جائزہ لیا ہے۔ اور اس جائزے میں کہیں بھی مجاز کا متن مجاز کی شخصیت سے الگ معلوم نہیں ہوتا۔ شاید مجاز کا شعری متن ایک خاص سیاق میں مجاز کی شخصیت کے بغیر پوری طرح تقسیم کے عمل سے نہیں گزر سکتا تھا۔ ایک جگہ انہوں نے لکھا ہے۔

> مجاز جب عورت سے محبت کرتا ہے وہ بے باک اور سرکش ہوتے ہوئے بھی نسائی دل کشی اور مریمی شان رکھتی ہے۔ حیا اور پاکیزگی اس کے اصلی جوہر ہیں یہ عورت ان بے پردہ بیویوں سے مختلف ہے جنہیں دیکھ کر اکبر الٰہ آبادی غیرت قومی سے زمین میں گڑ گئے تھے۔ مجاز نے جب عورت کی محبت میں عنفوان شباب کے حوصلوں سے معمور والہانہ سرشاری کے گیت گائے تھے وہ عورت مجاز کے ساتھ دور تک نہ جا سکی۔ مجاز کی شکست پیہم کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔"

خلیل الرحمٰن اعظمی نے مجاز کی شاعری کو ایک خاص حوالے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ حوالہ مجاز کے تعلق سے آج بھی بہت اہم ہے، کمال یہ ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اختر شیرازی اور جوش کے تصور عورت سے بھی مجاز کو مختلف ثابت کیا ہے۔ اس مطالعے سے مجاز کے تخلیقی ذہن کی انفرادیت کا بھی سراغ ملتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ اگر کسی ترقی پسند یا ترقی پسندی سے متاثر ہونے والے شاعر کا مطالعہ نظریے کی روشنی میں نہیں بلکہ متن کی روشنی میں ہی کیا جانا چاہیے، نظریہ کہاں کیا سے کیا شکل اختیار

کرتا ہے یہ پہلے سے طے کر لینا غلط ہے۔

''عورت مجاز کی شخصیت اور شاعری کا محور بھی ہے اور اس کی بہت بڑی محرومی اور تشنگی بھی... اس نے اپنے جسم کو میکدے کی آگ میں جلا ڈالا لیکن اپنے ذہن کو نفسیاتی پیچیدگیوں و مریضانہ رجحان سے محفوظ رکھا۔''

آل احمد سرور نے اپنے تفصیلی مضمون ''مجاز رومانیت کا شہید'' میں مجاز کی شخصیت کا بہت خوبصورت جائزہ لیا ہے اور اخیر میں ان کی شاعری کے اہم نکات اور محاسن کی جانب اشارے کیے ہیں۔ ان کی چند باتیں مجاز کے تعلق سے بہت متاثر کرتی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنی مجاز کے یہاں کلاسیکل شعرا کے انداز بیان کی باوقار سادگی ملتی ہے۔ دوسرے اس کے یہاں الفاظ کی صحت اور زبان کی نرمی و نزاکت کا احساس بھی ہم عصروں سے کچھ زیادہ ہے۔ تیسری اہم بات یہ ہے کہ مجاز کے یہاں استعارے، تشبیہات ایک خلاقانہ ذہن ظاہر کرتے ہیں۔

مجاز کے انتقال کے بعد اگر کسی نقاد نے مستقل طور پر مجاز کو یاد رکھا ہے تو وہ محمد حسن ہیں۔ اس وقت ان کے ناول غم دل وحشت دل پر گفتگو کا موقع نہیں۔ لیکن یہ ناول دراصل مجاز کی شخصیت کے جادو کی جانب اشارا کرتا ہے۔ اس طرح مجاز کے تعلق سے محمد حسن کی ایک ڈائری جو مجاز کو سمجھنے میں بہت معاون ہو سکتی ہے۔ اس میں مجاز کے تخلیقی ذہن کے ساتھ ساتھ تنقیدی ذہن بھی سمٹ آیا ہے۔ محمد حسن نے بہت دلچسپ طریقہ سے ان ملاقاتوں اور باتوں کو مرتب کیا ہے۔ ان کا مضمون ''شاعر محفل وفا'' بھی مجاز کی شاعری کو مجاز کی شخصیت اور عہد کی روشنی میں دیکھنے کی ایک کوشش ہے۔ محمد حسن کے یہ الفاظ ملاحظہ کیجیے:

مجاز کے متعدد ہم عصر، خواہ شاعر ہوں یا نثر نگار اس کوشش میں فکر و فن کی بالیدگی اور حسن کھو بیٹھے اور ان کی شاعری اور افسانے

یا تو محض بیان حقیقت ہو کر رہ گئے یا محض حسرت تعمیر، مجاز نے
اس مرحلے میں بھی اپنی آواز کا وزن و وقار نہیں کھویا ان کی آواز
نہیں بھرائی اور ان کا لہجہ اکھڑا نہیں اور ان کی سنگیت بے سر نہیں
ہوا۔ وہ صرف رومانیت کو اتنا ہی موڑ دے پائے جتنا ان کا
آہنگ اور ان کے تجربے اور فن کی گہرائی اجازت دے سکتی تھی
وہ بڑے مفکر نہیں لیکن ایک حساس فن کار یقیناً ہیں اور ایک ایسے
فن کار جو اپنی ذات کی روشنی میں کائنات کو پہچاننے اور ممکن ہو تو
اسے بدلنے سے منہ نہیں موڑتے''

محمد حسن اور مطالعۂ مجاز ایک تفصیلی مطالعے کا موضوع ہے یہاں اس حوالے سے تفصیلی گفتگو کا موقع نہیں، لیکن یہ بات توجہ طلب ہے کہ محمد حسن صاحب نے جہاں مجاز کی انفرادی اور جذباتی ؟؟ کو وقت کے ساتھ وابستہ کر کے دیکھنے کی کوشش کی ہے وہیں ان کی زبان مجاز کے شخصی اظہار میں آرائشی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مطالعۂ مجاز کے یہ چند اہم حوالے ہیں جن کی طرف میں نے اشارے کیے میں نے اپنی گفتگو کا آغاز اس حقیقت سے کیا تھا کہ مجاز کے نقاد مجاز کی شخصیت کے سحر سے خود کو بچا نہیں سکے۔ اور مجاز کے شعری متن کی آزادانہ قرات ممکن نہیں ہو سکی۔ اس تجزیے اور مطالعے اس اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ بعض نقادوں نے مجاز کی شاعری کو ان کی شخصیت کے ساتھ کہیں دیکھا ہے، اور کہیں کہیں مجاز کے شعری طریقۂ کار کو بھی نشان زد کیا گیا ہے۔ جس عہد میں مجاز پر یہ تنقید لکھی گئی تھی وہ مجموعی طور پر ترقی پسند تحریک سے منسوب نہیں تھا یا اس وقت کا پورا ادبی معاشرہ مجاز کی اس لیے تعریف نہیں کر سکتا تھا کہ مجاز رومانیت کا شہید ہے یا اس کا کردار ایک افسانوی کردار ہے۔ مجاز کی جس نظم ''آوارہ'' کو اردو کی چند اہم نظموں میں ان نقادوں نے شامل کیا بعد کے کئی نقادوں نے اسے کمزور قرار دیا ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجاز شاعری کی آزادانہ قرأت

ممکن نہیں اور یہ کہ اگر مجاز کی مجموعی شاعری آزادانہ قرات کی متحمل نہیں تو ایسی صورت میں اسے کمزور شاعری کا نام دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس بات کا فیصلہ اتنی آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔ مجاز ہی نہیں بلکہ اردو کے کئی اہم شعرا کا متن تاریخ اور شخصیت سے گہرے طور پر وابستہ ہے۔ اگر اسے مرکز سے ہٹایئے تو بہت اچھے نتائج برآمد نہیں ہوتے۔ لیکن مجاز کی شاعری اپنے مرکز میں رہتے ہوئے ہماری ذہنی اور جذباتی کیفیتوں سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے جس کا تعلق کسی مخصوص عہد اور زمانے سے نہیں۔ اس سلسلے میں مجاز کی نظموں کے کئی بند اور مصرع پیش کیے جا سکتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر اس نکتے کی طرف آتا ہوں کہ مجاز کا شعری متن مجاز کی شخصیت سے اگر کسی حد تک الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے تو ابھی اس کی باضابطہ شروعات نہیں ہوئی، کچھ ابتدائی صورتیں علی گڑھ میگزین اور شاہراہ اور چند دیگر مضامین میں موجود ہیں۔ اس کے بعد ہی مجاز کو نئے منظر نامے میں ایک نئی زندگی ملے گی اور یہ کام نئی نسل کر سکتی ہے۔ مجھے اس بات پر اتفاق نہیں کہ مجاز کی شاعری سے اٹھنے والے ہر سوال کا جواب مجاز کی شخصیت فراہم کرتی ہے۔

نفیس بانو

مجاز کا تخلیقی سفر اور علی گڑھ

مجاز کے تخلیقی سفر کی ابتدا سینٹ جانس کالج آگرہ کی طالب علمی کے زمانے سے ہوتی ہے۔ یہاں حامد حسن قادری، آل احمد سرور اور جذبی کا ساتھ رہا۔ یہیں جذبی کے توسط سے میکش اکبر آبادی سے ملاقات ہوئی اور میکش کے توسط سے فانی بدایونی سے ملے۔ ان سے اصلاح بھی لی اور ان سے ناراض بھی ہوئے۔ آگرہ کے دورانِ قیام کی غزلوں کے تیور کچھ اس طرح تھے:

یوں ہی بیٹھے رہو بس دردِ دل سے بے خبر ہو کر
بنو کیوں چارہ گر تم کیا کرو گے چارہ گر ہو کر

ہجر میں کیفِ اضطراب نہ پوچھ خونِ دل بھی شراب ہوتا تھا
ان کے جلووں میں گھر گیا آخر ذرہ کو آفتاب ہوتا تھا

آخر کے دونوں اشعار پر فانی نے اصلاح دی تھی۔ تیسری بار بقول مجاز ''اپنے زعم میں

غالب سے بھی زیادہ اچھی غزل لکھ کر ان کے پاس لے گئے لیکن فانی نے اس شعر کو

یوں مسکرائے رخ سے اٹھا کر نقاب کو
کچھ بجلیوں نے گھیر لیا آفتاب کو

مہمل قرار دیتے ہوئے کہہ دیا۔ ''حضرت آپ برسوں کی راہ ایک دن میں طے کرنا چاہتے ہیں۔''

اور یہ کہ:

تبسم لب پر ہوتا ہے کہ چہرے کے چاروں طرف؟

مجاز دل برداشتہ ہوئے اور اپنے کمرے پر جا کر ایک گھنٹہ تک روتے رہے۔ ناراضگی کا اظہار ان کی غزل پر غزل لکھ کر برسرِ راہ سنا کر کیا:

سینے میں ان کے جلوے چھپائے ہوئے تو ہیں
ہم اپنے دل کو طور بنائے ہوئے تو ہیں

یاسیات کے امام نے اس ابھرتے ہوئے نوعمر شاعر کی افتادِ طبع کا اندازہ لگالیا۔ یاسیاست کا رنگ نوجوان شاعر کے نشاطیہ موڈ پر اثر انداز نہ ہو لہٰذا اصلاح لینے سے انہیں منع کر دیا۔ ہاں فنی سقم کا ''اشتباہ دور'' کرنے کی اجازت دے دی۔ (بحوالہ مجاز۔ 'حیات اور شاعری'۔ منظر سلیم، ص ۲۸)

کالج کے مشاعرے میں ان کی غزل کو پہلا انعام ملا، حوصلہ افزائی ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کی تعلیم سے زیادہ ان کی توجہ شاعری کی طرف رہی۔ مملکتِ سخن میں باریابی کے لیے مجاز نے کڑی مشقِ سخن کی۔ علی گڑھ میں آنے کے بعد ان کی کئی معرکۃ الآرا نظموں نے وہ دھاک جمائی کہ ان کی زیادہ تر توجہ نظم پر مرکوز ہوگئی۔ پھر بھی وہ وقتاً فوقتاً غزل بھی کہتے رہے۔ مجاز کی غزل میں کلاسیکیت کا رنگ ضرور ہے لیکن ارضیت کا گہرا رنگ ان کی غزل کو روایت سے الگ کرتا ہے۔ یہی ارضیت ان کی غزل کو ابدیت بخشتی ہے۔ ان کے دوست

جذبی کی توجہ غزل کی طرف زیادہ رہی۔ ان کے دوسرے دوست سردار جعفری نظم لکھ رہے تھے لیکن ان کا اسلوب مجاز سے الگ رہا۔ جعفری وضاحت اور صراحت کی بھی وکالت کرتے ہیں جب کہ مجاز شعری رمزیت اور اشاریت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ والد کا تبادلہ علی گڑھ ہو جاتا ہے۔ مجاز دو سال آگرہ میں گزار کر ۱۹۳۱ء میں مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ آجاتے ہیں۔ علی گڑھ میں دسمبر ۱۹۳۲ء میں انجمنِ حدیقۃ الشعر کے سالانہ مشاعرے میں حسرت موہانی، اصغر گونڈوی اور حفیظ جالندھری کی موجودگی میں نظم 'صبحِ بہار' سنائی۔ پروفیسر سرور لکھتے ہیں:

> ''اس (نظم) کی رنگینی اور دلکشی اور پڑھنے والے کے پرسوز ترنم نے داد بھی حاصل کی۔ یہ مجاز کا علی گڑھ سے پہلا تعارف تھا۔'' (مجاز رومانیت کا شہید)

یہاں شاعر علی گڑھ کی رنگین اور دلکش نمائش کے پرکشش نظاروں میں کھو جاتا ہے۔ نظم 'نمائش' میں علی گڑھ کی نمائش اپنی تمام رنگینیوں و جلوہ سامانیوں اور شباب کی سرمستیوں کے ساتھ صفحۂ قرطاس پہ اتر آئی۔

کوئی آئینہ دارِ حسنِ فارس کسی میں حسنِ یونانی کے جوہر
کوئی حسن میں عذرائے وامق کوئی ناز میں سلمائے اختر

علی گڑھ کے ابتدائی زمانے کی ایک یادگار غزل 'تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیِ کرم فرما بھی گئے۔ کے آخری شعر میں ''انجمنِ عرفانی کا استعارہ'' دانشگاہِ علی گڑھ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ان کی شاعری کا ارتقائی دور اسی 'انجمنِ عرفانی' سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۹۳۳ء کی غزل میں ایک شعر ہے:

اس محفلِ کیف و مستی میں، اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے، ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

۱۹۳۴ء کے زمانے کی ایک غزل کے یہ دو اشعار وقت کی ستم رانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے
اے شوقِ نظارہ کیا کہیے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصور کیا کہیے ہم صورتِ جاناں بھول گئے

'شورشِ دوراں' کی فارسی ترکیب میں ہندستان کی دگرگوں صورتِ حال کا اشارہ تہہ نشین ہے۔ مجاز کے آگرہ اور علی گڑھ کے سینیئر ساتھی پروفیسر آل احمد سرور مجاز کی غزل میں 'شوق کی بیباکی، جنوں کی بلند حوصلگی، جذبے کی مصوری کو سراہتے ہیں۔ اپنے عہد کے تقاضوں کے تحت، خیال کے ارتکاز کی خاطر انہوں نے اظہار کے لیے زیادہ تر نظم کا انتخاب کیا۔ ورنہ بنیادی طور پر ان کا شعری مزاج غزلیہ ہے۔ تاہم عیادت، مادام، شہر آشوب، آج کی رات، گریز اور دیگر نظموں پہ ان کی غزل کے مزاج و آہنگ کا پرتو نظر آتا ہے۔ علی گڑھ میں ان کی شعری صلاحیتوں کو مزید نکھرنے اور ترقی کرنے کے مواقع ملے۔ شفقتیں، صحبتیں ملیں اور محبتیں بھی ملیں۔ یہاں کی کھلی فضا میں ان کی شاعری مزید صحت مند ہوئی۔ یہاں انیسویں صدی سے ہی شعر و ادب میں نئے صحت مند رجحانات و میلانات آرہے تھے۔ ادبی، سماجی اور سیاسی سطح پر تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ علی گڑھ کا ایک قومی کلچر تھا، تہذیب تھی، جس کی تاریخ اس میکدۂ علم و دانش کے پیرِ مغاں سرسید سے شروع ہوتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''مجاز کی رومانی زندگی کو سب سے پہلے جس معاشرت سے دوچار ہونا پڑا وہ علی گڑھ کی معاشرت ہے۔ علی گڑھ کے پس منظر کے بغیر مجاز کی نظموں کے محرکات کو سمجھنا آسان نہیں۔ علی گڑھ

ہندستانی مسلمانوں کی سب سے بڑی دانش گاہ ہونے کے علاوہ
نئی تہذیب کا سب سے بڑا منبع تھا'' (ترقی پسند ادبی تحریک)

بلاشبہ علی گڑھ کی معاشرت نے ان کی شعری زندگی کو ایک نیا موڑ دیا، بصارت کے ساتھ بصیرت عطا کی۔ یہیں ان کا 'ذوقِ نظر' حقیقت کو سمجھنے کے لایق بنا۔ یہیں وہ احتجاج اور انقلاب کی آوازوں کو اپنی مخصوص آواز میں اس طرح ملا دیتے ہیں کہ یہ ان کا اختصاص بن جاتا ہے۔ ان کے ہمعصر بھی کھلے دل سے جس کا اعتراف کرتے ہیں۔ مجاز رومانویت کی شاہراہ میں اپنے موءِ قلم سے جذبات واحساسات کے دیدہ زیب گل بوٹے بنا رہے تھے اب وہ انقلابیت کی سنگلاخ راہوں پر اپنا اشہبِ قلم دوڑانے لگے۔ یہیں علی گڑھ میں ان کی نظر اظہارِ ذات کی محدودیت سے نکل کر حتی الامکان کائنات کی آفاقیت تک پہنچنے کے قابل ہوئی۔ انیسویں صدی کے علی گڑھ میں روایت سے انحراف نے فکری جمود کو توڑ کر افکار و نظریات کو تحریک دی تھی، نئے زاویے دیے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ایک مردِ مجاہد غزل کی حمایت میں کھڑا ہوتا ہے۔ حالی کی معتوب غزل کو مردِ مجاہد حسرت موہانی نے شانِ محبوبیت بخشی۔ علی گڑھ تحریک کی بڑھی ہوئی عقلیت پسندی کے ردِ عمل میں رومانوی رجحان آیا۔ جس کے علم بردار علی گڑھ میں سجاد حیدر یلدرم تھے۔ اس رجحان نے شعر و ادب کو اپنی پوری گرفت میں لے رکھا تھا۔ ترقی پسند تحریک کی حقیقت پسندی نے اس پر اپنی گرفت مضبوط کی تو شاعری میں رومان و حقیقت کا خوبصورت امتزاج سامنے آیا۔ جس کی خوبصورت مثال مجاز کی شاعری ہے۔ اسی حسین امتزاج کے لیے فیض نے ''آہنگ'' کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''شمشیر کی صلابت اور ساز و جام کا گداز دونوں ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہیں'' انہیں خصوصیات کے پیشِ نظر پروفیسر آل احمد سرور نے مجاز کو 'رومانیت کا شہید' لکھا ہے۔ رومانیت کا شہید اب زندگی کے دوسرے رخ سے بھی آشنا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رشید جہاں کا تعلق تعلیم یافتہ اور روشن خیال گھرانے سے تھا۔ جس نے تعلیم نسواں کے لیے عملی قدم

اٹھایا۔ سب سے بڑھ کر ان کی شخصیت کا شناخت نامہ ''انگارے'' تھا۔ وہ ڈاکٹر رشید جہاں جنہوں نے لاہور میں فیض کو مارکسی نظریات پر مبنی مطالعہ کے لیے ایک کتاب دے کر ان کے طرزِ فکر کو پوری طرح بدل کر رکھ دیا۔ (جس کا اعتراف خود فیض نے کیا ہے۔) علی گڑھ کے آفتاب ہوسٹل میں مقیم اختر رائے پوری ترقی پسند نظریات پر مبنی اپنی کتاب 'ادب و انقلاب' لکھ رہے تھے۔ حیات اللہ انصاری بھی علی گڑھ کے ہوسٹل میں تھے۔ ترقی پسند تحریک کے میرِ کارواں سجاد ظہیر بھی کچھ دنوں کے لیے لندن سے ہندستان واپس آئے تھے۔ اور اپنے نظریات کی اشاعت میں سرگرمِ عمل تھے۔ معاشرتی، سماجی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں سے علی گڑھ کے طالب علم بے خبر نہ تھے۔ بلکہ ملک کی احتجاجی فضا سے اثر لے رہے تھے۔ مجاز کی بھی اشتراکی نظریات سے وابستگی بڑھی۔ علی گڑھ میں یونین ہال کی اہمیت ہر دور میں رہی ہے۔ یہاں کے ادبی، سیاسی اور سماجی پروگرام طالب علموں کی ذہنی بالیدگی میں معاون ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی میں اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ یونین ہال میں ہی مجاز نے ڈاکٹر ذاکر حسین کی موجودگی میں اپنی نظم 'نذرِ علی گڑھ' سنائی علی گڑھ میں دھوم مچ گئی۔ بقول ابواللیث صدیقی مجاز نے جب یہ شعر پڑھا:

آ آ کے ہزاروں بار یہاں خود آگ بھی ہم نے لگائی ہے
پھر سارے جہاں نے دیکھا ہے یہ آگ ہمیں نے بجھائی ہے

('مجاز'' نقوش' اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص ۹۱۷)

تو ڈاکٹر ذاکر حسین نے دوبارہ پڑھنے کی فرمائش کی۔ مجاز کے اس شعر میں اُس طرف اشارہ ہے جب علی گڑھ کے طالب علموں پر یونی ورسٹی کے مفادات کو نقصان پہنچانے کا الزام تھا۔ یونین ہال میں پڑھی ہوئی مجاز کی ایک نظم 'انقلاب' بھی بہت مشہور ہوئی۔ سردار جعفری لکھتے ہیں:

''میں نے مجاز کی پہلی نظم جو اُس کی زبان سے سنی 'انقلاب' تھی۔

یہ غالباً ۱۹۳۳ء کا زمانہ تھا اور ہندستان کے نوجوانوں میں ایک عام بے چینی کی لہر دوڑی ہوئی تھی۔ فضا میں سوشلزم کے نعرے بلند ہو رہے تھے جو کانگریس کے ایوانوں تک پہنچ گئے۔ اور ۱۹۳۶ء میں کانگریس کے لکھنؤ اجلاس کے صدارتی خطبے میں پنڈت نہرو کی زبان سے ادا ہوئے۔"

یہ نظم برطانوی سامراج کے خلاف ہندستانی نوجوانوں کے اندر غم و غصہ اور اضطراب و احتجاج نہ صرف ظاہر کرتی ہے بلکہ یقین اور اعتماد کا لہجہ بھی رکھتی ہے۔

فرشِ گیتی سے سکوں اب مائلِ پرواز ہے
ابر کے پردوں سے اب سازِ جنگ کی آواز ہے
پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب

شاعرِ مشرق اقبال پہلے ہی نوجوانوں کی ذہن سازی کا کام یہ کہہ کر کر چکے تھے کہ:

میں تم کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

ابواللیث صدیقی کا کہنا ہے کہ:

"..... مجاز نے پہلی مرتبہ علی گڑھ یونین میں پڑھا تو آواز میں ایسا جوش تھا جیسے وہ یونین سے باہر نکلتے ہی جام چھوڑ کر شمشیر اٹھالیں گے۔" (نقوش، مجاز نمبر)

سردار جعفری لکھتے ہیں:

"..... شدید رومانیت ہے۔ ایک ایک مصرعے پر داد مل رہی تھی..... وہ یونیورسٹی کا محبوب ترین شاعر ہے۔ جاں نثار اختر اور

جذبی بھی طالب علم ہیں لیکن مجاز کی مقبولیت الگ ہی چیز ہے۔'' (لکھنؤ کی پانچ راتیں)

علی گڑھ میں پڑھی ہوئی ان کی یہ یادگار نظمیں ہیں۔ علی گڑھ میں ہی ان کے اندر 'شاعرِ بیدار' ہونے کا احساس مستحکم ہوتا ہے۔ 'آج بھی' گریز، عشرتِ تنہائی جیسی اور بھی دیگر نظموں کے رومانوی مزاج میں انقلابی تیور بھی ابھرتا ہے۔ یہاں طرزِ اظہار میں رعنائی اور خیال میں گہرائی آئی۔ نظم 'انقلاب' کے بعد 'اندھیری رات کا مسافر' میں شاعر کو اندازہ ہوتا ہے کہ انقلاب کا آنا اتنا آسان بھی نہیں۔ مگر مایوس بھی نہیں ہوتا، اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہے۔ ۱۹۳۹ء میں لکھی گئی 'خوابِ سحر' فکر انگیز نظم ہے۔ جس میں شاعر کی نظر ماضی کی تاریخ پر بھی پڑتی ہے اور فرسودہ روایت کی جکڑ بندیوں کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔

مہر صدیوں سے چمکتا ہی رہا افلاک پر
رات ہی طاری رہی انسان کے ادراک پر

پندرہ اشعار پر مشتمل نظم کا آخری شعر ہے:

کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اس طرف دیکھا تو ہے

نظم رات اور ریل، حرکت و عمل، سرکشی اور بغاوت کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے۔ یہ نظم ہفتہ وار اخبار 'ہندستان' لکھنؤ میں جب شایع ہوئی تو فراق نے اپنے ستائشی خط میں لکھا کہ ''پہلی بار اردو شاعری نے سائنسی اور تکنالوجی کے نئے مظاہر کو اپنا کر انہیں شعری معنویت عطا کی'' (بحوالہ 'غمِ دل وحشتِ دل' میں ص ۲۰۹)

علی گڑھ کی معاشرتی اور ادبی زندگی کی اثر پذیری کا فیضان 'نذرِ خالدہ' نوجوان خاتون سے، عصمت اور پردہ جیسی نظموں میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کے ذہن میں عورت کا

صحت مند تصور ہے۔ یہ تصور خاص علی گڑھ کی ہی دین ہے۔ شعروادب کی دنیا کو شاعر سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ ۱۹۳۵ء میں علی گڑھ سے بی۔اے کرنے کے بعد ایم اے سالِ اول میں ہی انہیں 'علی گڑھ میگزین' کا ایڈیٹر بنادیا گیا۔ ملازمت کے سلسلے میں انہیں 'خلدِ علی گڑھ کی ہزاروں محفلیں' چھوڑ کر دہلی جانا پڑا۔ مگر علی گڑھ سے رشتہ استوار رہا۔ دلی میں ان کی بربادی کی داستان شروع ہوئی۔ کچھ داخلی اور کچھ خارجی عوامل کی کارکردگیاں راہ میں حائل ہوئیں۔ اُدھر 'زلیخا رفیقِ مہِ کنعاں نہ بنی' ادھر پنجاب و یوپی کا معاملہ طول پکڑ گیا۔ ملازمت کی بحالی کے لیے علی گڑھ سے رشید صاحب کی سفارش بھی کام نہ آئی۔ ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر پطرس بخاری کے دل سے علاقائی عصبیت کا بخار نہ اترا۔ یہ شاعرِ محفلِ وفا، مطربِ بزمِ دلبراں ایک طرف دلی میں 'بنتِ مہتاب' کو دل نذر کر آیا اور دوسری طرف لکھنؤ میں بنتِ عنب کو جان ہی دے بیٹھا۔ سردار جعفری نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''یہ بات یقین اور وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی آغوش سے جتنے شاعر اٹھے ان میں سب سے زیادہ مقبولیت مجاز کو ملی۔ سب سے زیادہ احترام مولانا حسرت موہانی اور مولانا محمد علی کو ملا اور سب سے زیادہ دلآویز شخصیت بھی مجاز ہی کی تھی اس شخصیت میں انقلاب اور رومان کا ایک بہت حسین امتزاج تھا...'' (دیباچہ مجاز۔ شخص و شاعر از معیزہ عثمانی)

شخصیت میں اسی حسین امتزاج نے ذاتی زندگی کی ناکامیوں، محرومیوں اور ناآسودگیوں کے باوجود ان کی شاعری کو محزونیت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ بلکہ محزونیت میں بھی نشاطیہ کیف کی چاشنی عطا کردی۔ لہجہ میں غضب کی غنائیت نے ایک ایک لفظ میں نغمگی بھردی، یہی نغمگی، ترنم، اور الفاظ میں موسیقیت کی جھنکار انہیں اپنے معاصرین سے الگ کرتی ہے۔ تصوراتی حسن و عشق کی دنیا میں آنسو، تبسم، ہجر و وصال کا ذکر ہوتا آیا ہے

لیکن مجاز کے یہاں اس ذکر میں زمینی عشق سے گہری وابستگی نے جس طرح کیف وسرور کی دنیا آباد کی ہے، وہ ان کا اپنا امتیاز ہے۔ سردار جعفری لکھتے ہیں:

''غیر ترقی پسند نقادوں نے مجاز کو نوجوانوں کا شاعر قرار دے دیا اور ترقی پسند نقادوں نے زورِ قلم اس کی شراب نوشی اور شخصیت کی شکست پر صرف کر دیا'' (دیباچہ مجاز۔ شخص و شاعر از معیز ہ عثمانی)

مجاز صرف نوجوانوں کے شاعر ہیں، کہہ کر ان کی اہمیت کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں سازِ کرب پہ جو شیریں نغمے انہوں نے چھیڑے ہیں۔ زندگی میں ان کی بھی اپنی اہمیت ہے۔ ایک طرف ذکر جاناں میں زندگی کی جاندار تصویریں ہیں تو دوسری طرف شورشِ دوراں کے بیان میں جوش و حرارت ہے لیکن شور شرابہ نہیں۔ ''بول اری او دھرتی بول راج سنگھاسن ڈوانواڈول'' کا شور و شرابہ ان کا اختصاص نہیں۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے مجاز کے لیے لکھا تھا کہ ''انقلاب کا ڈھنڈورا زیادہ پیٹتے ہیں۔'' اس کے برعکس فیض انہیں 'انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں بلکہ مطرب' کہتے ہیں۔ کلیم الدین نے میر پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا:

''.....اپنے حدود کے اندر میر لاجواب ہیں۔ چند چیزیں جو صرف انہیں کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں اور اس لحاظ سے وہ یگانہ و یکتا ہیں۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر، ص ۱۳۱)

یہ بات مجاز پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ غنائی لہجہ اور زندگی کے وہ انفرادی حوالے جو انہیں کے ساتھ مخصوص ہیں، جنہیں شعر کے سانچے میں ڈھال کر شاعر نے شاہکار بنا دیا۔ وہ یگانہ و یکتا نہ بھی ہوں تو بھی علی گڑھ کے ہر دل عزیز اور مقبول شاعر تو رہیں گے۔ اس لحاظ سے مجاز یگانہ اور یکتا بھی ہیں کہ اپنے تمام معاصرین میں وہ انتہائی کم عمری میں ہی

مقبولیت کی منزل تک پہنچے۔ اور کم عمری میں ہی دنیا سے رخصت بھی ہو گئے۔ دانش گاہِ علی گڑھ میں اسرار الحق مجاز کے ترانۂ محبت و نذرانۂ عقیدت کی گونج ہمیشہ سنی جاتی رہے گی۔ غرض علی گڑھ کے پانچ سالہ قیام کو ان کے ادبی سفر میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔

صالحہ زرین

مجاز کی ترقی پسند غزلیہ شاعری

یوں تو مجاز ایک ترقی پسند نظم گو کی حیثیت سے پہچانے گئے مگر مجاز نے اردو کے عام شعرا کی طرح اپنی شاعری کی ابتدا غزلوں سے کی تھی۔ (جن کی کل تعداد ۴۱ ہے) گھر میں شعروادب کا ماحول تھا اس زمانے میں کلاسیکی نوعیت کی غزلیں کہنا اور حرف ولفظ کی تخلیقی معرفت حاصل کرنا شرفائے ادب کا شیوہ ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ مجاز نے خاندانی اور تہذیبی روایت کے مطابق شعروشاعری کی ابتدا غزلیہ شاعری سے کی، ابتداً تقاضائے عمری کے تحت رومانی مزاج کی غزلیں کہیں۔ لیکن جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے گئے ان کی اصل افتادِ طبیعت نکھرنے لگی اور ملک و معاشرہ پر ان کی نظریں دوڑنے لگیں تو فکر اور تخلیق بھی کروٹیں بدلنے لگیں۔ یہ زمانہ دھیرے دھیرے دوسری عالمی جنگِ عظیم کی طرف جارہا تھا۔ ایک عام کسادِ بازاری نے عام انسان کی زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب تک وہ لکھنؤ میں رہے۔ روایتی غزل کے ہی شاعر رہے بغرض تعلیم جب وہ لکھنؤ سے آگرہ پہنچے تو یہاں کے حالات بھی بہت الگ اور مختلف نہ تھے اور وہ اس نوعیت کے اشعار کہنے لگے۔

حسن کو بے حجاب ہونا تھا
شوق کو کامیاب ہونا تھا
ہجر میں کیفِ اضطراب نہ پوچھ
خونِ دل بھی شراب ہونا تھا
تیرے جلووں میں گھر گیا آخر
ذرّے کو آفتاب ہونا تھا

اپنی اس طرح کی رومانی نوعیت کی غزلوں کو لے کر وہ بغرض اصلاح اُس دور کے مستند اُستاد فانی کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ فانی نے دو ایک بار اصلاح تو کر دی لیکن مجاز کی فطری افتادِ طبیعت کو دیکھتے ہوئے صاف طور پر کہہ دیا ''مجھ سے اصلاح نہ لیا کرو میرا غم تمہاری خوشی کو روند ڈالے گا'' مجاز نے پھر کوئی اصلاح نہ لی اور آزادانہ طور پر غزلیں کہنے لگے اس زمانے میں مجاز مجاز نہ تھے بلکہ شہید تخلص کرتے تھے لیکن جلد ہی وہ مجاز ہو گئے اور وہ مزید تعلیم کے لیے آگرہ سے علی گڑھ آ گئے۔ علی گڑھ میں نہ صرف تعلیم کا معیار بے حد بلند تھا بلکہ ترقی پسند خیالات کی گہما گہمی اور گرمی تھی۔ کنور محمد اشرف، اختر حسین رائے پوری، حیات اللہ انصاری اور دوسرے مغربی تعلیم سے آراستہ اور اشتراکی خیالات سے پیراستہ ہو کر علی گڑھ کی فضا کو ترقی پسند بنائے ہوئے تھے۔ مجاز کی طبیعت کو ایک نیا راستہ ملا اور فکر و فطرت نے ماحول کو ہموار دیکھا۔ اس سے اُن کی نئی نظم نگاری کا آغاز ہوا ہی نیز غزلوں کے مزاج میں انقلابی تبدیلی رونما ہوئی۔ مجاز سے ذرا قبل حسرت موہانی، اختر شیرانی وغیرہ کی غزلوں نے بھی روایتی تصورِ عشق اور محبوب کی شخصیت کو بدلنا شروع کر دیا تھا۔ مجاز نے بھی اپنی غزلوں میں محبوب کو روایتی راہوں اور رویوں سے نکال کر سات پردوں سے باہر نکالا۔ کیونکہ محبوب کا یہی غزلوں میں تو ہمیشہ پردہ میں چھپا ہوا کرتا تھا۔ جس کے حُسن کے دیدار کے لیے عاشق بے قرار رہتا تھا مگر مجاز نے محبوب اور عاشق کے درمیان پردہ کو

بنا کر محبوب کو بے حجاب کر دیا۔ ان غزلوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی محبوبہ سامنے بیٹھی ہوئی ہے وہ اُس سے محوِ گفتگو ہیں۔

بارہا ایسا ہوا ہے یاد تک دل میں نہ تھی
بارہا مستی میں لب پر ان کا نام آ ہی گیا

یہ آنا کوئی آنا ہے کہ بس رسماً چلے آئے
یہ ملنا خاک ملنا ہے کہ دل سے دل نہیں ملتا

تاثیر جذبِ شوق دکھائے ہوئے تو ہیں
ہم تیرا ہر حجاب اُٹھائے ہوئے تو ہیں
ہاں! کیا ہوا وہ حوصلہ دید اہلِ دل
دیکھو نہ وہ نقاب اُٹھائے ہوئے تو ہے

مجاز اپنے اور اپنے محبوب کے درمیان حائل حجاب کو بار بار اُٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور محبوب کے دید کا اشتیاق بھی اتنا بڑھ جاتا ہے کہ وہ اپنے نقاب کو خود ہی اُلٹ دیتا ہے یعنی مجاز کی محبوبہ کے دل میں بھی دیکھنے اور دکھانے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر ان اشعار کی روشنی میں یہاں پر دیکھا جائے تو مجاز کی رومانی اور عشقیہ شاعری دونوں نظر آتی ہے۔ اور اسی طرح ایک دوسری غزل کا رنگ دیکھیے:

مجھ کو یہ آرزو وہ اُٹھائیں نقاب خود
اُن کو یہ انتظار تقاضہ کرے کوئی

مجاز اپنی غزلوں میں اس بات کو صاف طور پر اور کھلے انداز میں بیان کرتے ہیں کہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میرا محبوب خود ہی اپنے چہرے سے نقاب اُٹھائے مگر جو اتنی

ناز و انداز والی محبوبہ ہے اُس کے دل میں بھی یہی آرزو ہوتی ہے کہ کوئی چہرے سے پردہ ہٹانے کا تقاضہ تو کرے۔ مجاز نے اردو غزل کو اس مقام پر لاکر کھڑا کر دیا جہاں عاشق و معشوق دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو جاتے ہیں۔ بیچ میں جو ایک حجاب تھا وہ ختم ہو جاتا ہے۔ غزل میں مجاز نے جو ایک تبدیلی پیدا کی جس کی وجہ سے زندگی میں سرشاری اور حرارت پیدا ہو گئی۔

رات تاروں کو ٹوٹنا بھی مجاز
باعثِ اضطراب ہونا تھا

اس مصرعہ میں مجاز کی بے چینی آسمان کے ٹوٹتے ہوئے تاروں میں دیکھ کر ہوتی ہے کیونکہ تاروں کا ٹوٹنا خراب علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یا مجاز کی ایک دوسری غزل جو انہوں نے علی گڑھ میں ۱۹۳۱ء میں کہی یہاں وہ حسن کی باتیں ایک نئے انداز سے کرتے ہیں:

دکھا دے ایک دن اے حسنِ رنگیں جلوہ گر ہو کر
وہ نظارہ جو ان آنکھوں میں رہ جائے نظر ہو کر
فلک کی سمت کس حسرت سے تکتے ہیں معاذ اللہ
یہ نالے نارسا ہو کر یہ آہیں بے اثر ہو کر
یہ کس کے حسن کے رنگین جلوے چھائے جاتے ہیں
شفق کی سرخیاں بن کر تجلی سحر ہو کر

یہاں مجاز اپنے شوخ محبوب جس کو حُسن رنگین کہہ کر مخاطب کرتے ہیں جس کی جلوہ گری کے منتظر رہتے ہیں اور اُن نظاروں کو نظر میں سمو لینے کی باتیں کرتے ہیں۔ حقیقی محبوب کی باتیں کرتے ہیں کہ اُس کے حسن کے رنگین جلوے شفق کی سرخی اور تجلی سحر بن کر آسمان پر چھا جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اُمید و نشاط کا ایک ملا جلا امتزاج نظر آتا ہے۔

اُمید کی باتیں کرتے نا اُمیدی اور مایوسی کو جلدی قریب نہیں آنے دیتے کیونکہ مجاز کا نظریۂ زندگی تبدیلیٔ حیات اور تعمیرِ حیات سے وابستہ ہے۔ وہ غزل میں جو مضمون باندھتے ہیں اُس کا انداز بہت دلنشیں تو ہوتا ہے با مقصد بھی ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں سوز و ساز دونوں ہی ہوتا ہے محبت اور معنویت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ غزل:

سارا عالم گوش بر آواز ہے
آج کن ہاتھوں میں دل کا ساز ہے
ہم نشیں دل کی حقیقت کیا کہوں
حسن کو پردے پہ اپنے ناز ہے
چھپ گئے وہ سازِ ہستی چھیڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے
حُسن کو ناحق پشیماں کر دیا
اے جنوں یہ بھی کوئی انداز ہے
ساری محفل جس پہ جھوم اٹھی مجاز
وہ تو آوازِ شکستِ ساز ہے

مجاز غزل میں جس بات کو کہنا چاہتے ہیں وہ ایک خاص ترنم اور لے کے ساتھ کہہ دیتے ہیں اور نہ ہی اُن کے پیغام میں کمی آتی ہے اور نہ ہی رنگ و آہنگ میں۔ اس غزل میں بظاہر روایتی اندازِ سخن نظر آئے گا لیکن آواز اور انداز بدلا ہوا بھی نظر آئے گا۔ دل کا ساز، سازِ ہستی، شکستِ ساز، غرضیکہ ساز ہی ساز، ساز اور آواز کی مختلف کیفیتیں آپ کو اس غزل میں ملیں گی کہ حرف و لفظ اور اسلوب و آہنگ روایتی سا لگتا ہے لیکن مکمل غزل کا جو تاثر ہے وہ نیا نیا سا ہے۔ مجاز کے پاس ایک نرم اور گداز دل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نرمی اور شگفتگی و شادابی ان کی اکثر غزلوں میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ابتدائی غزلوں میں مجاز نے حُسن و عشق

کی باتیں اپنے عمر کے لحاظ سے کی ہیں مگر بعد کی غزلوں میں بدلے ہوئے عشق کے طرز بھی نظر آتے ہیں۔ جہاں دوسری شعرا اپنی محبوبہ کا نام بتانا پسند نہ کرتے ہوں وہاں پر مجاز اس رسم کو توڑتے نظر آتے ہیں۔ مجاز نے اپنی محبوبہ ''نور'' پر چند اشعار جو بڑے لطیف پیرائے میں عورت کے پیغام کو بہت مؤثر ڈھنگ سے پیش کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
تری چینِ جبیں خود ایک سزا قانونِ فطرت میں
اسی شمشیر سے کارِ سزا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے کا ٹیکا مرد کی قسمت کا تارا ہے
اگر تو سازِ بیداری اٹھا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مجاز کے ان اشعار کو پڑھتے وقت اقبال کی نظم ''عورت'' اور ''تعلیم نسواں'' یاد آتی ہے کیونکہ اقبال نے بھی اپنی انہیں نظموں میں تعلیم کے ذریعہ عورتوں کو بیدار کرنے کی بات کہی ہے۔ مگر مجاز اقبال سے دو چار قدم اور آگے بڑھ کر عورت کو اس کی طاقت کا بھرپور احساس دلاتے ہیں۔ مجاز نے ان اشعار کے ذریعہ عورت کو خود ہی اپنی نظر میں عصمت کی محافظت کی بات کہی ہے۔ کیونکہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ عورت کی عصمت کی پاسداری مرد کرتا ہے مگر مجاز کی ترقی پسند فکر یہاں عورت کے لیے ایک الگ انداز کی دکھائی دیتی ہے۔ عورت کو نشتر کی تیزی کو آزمانے کی باتیں کرتے ہیں جو بات آج تانیثی تحریک کے حوالے سے کہی جارہی ہے کہ عورت قانون پڑھ سکتی ہے۔ اپنے حقوق کو قانون کے ذریعہ حاصل کرسکتی ہے۔ یہی اُس کی اصل شمشیر ہے جس کا بدلہ وہ ظالم اور جابر مرد سے لے سکتی ہے،

صدیوں سے اُسے عورت ہونے کی سزا دی جاتی تھی۔ تیسرے مصرعہ میں مجاز نے عورت کو گھر کی محفل کہا ہے خواہ وہ کوئی بھی جگہ ہو عورت سے ہی اُس کی زینت قائم رہتی ہے کیونکہ فطرت نے اُس کے سینے میں بے پناہ محبت دی ہے، جہاں وہ زمین و آسمان کی وسعت کو سمیٹ سکتی ہے۔ عورت کی تعریف میں وہ یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ ترے ماتھے کی یہ کامرد کی قسمت کا تارا ہے اگر تو سازِ بیداری اُٹھا لیتی تو اچھا تھا۔ آخر میں وہ پھر عورت کو بیدا رہونے کی بات کہتے ہیں۔ اس بیداری سے مراد علمی بیداری و سماجی بیداری اور جب وہ علم سے باخبر ہوگی تو اپنے آپ ہی عورت میں قوتِ احساس کا جنم ہوگا اور وہ زندگی کو نئی طرح سے جینے کا عادی بنائے گی جس کی وجہ سے ظلم کے خلاف لڑنے کی قوت بھی پیدا ہوگی، عورت کی تعریف کرتے ہوئے مجاز نے عورت کے آنچل کو پرچم تک بنا ڈالا۔ عورت کے ماتھے پر آنچل بے حد زیب دیتا ہے مگر وہ اس آنچل کو بیداری کا پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا۔ آنچل کو پرچم اس لیے کہا ہے کہ پرچم کے ذریعہ ہی اپنے پورے قبیلے کی قیادت ہوتی ہے۔

زندگی کی یہی اعلیٰ فکریں اور مسائل شاعری کو بڑا بناتی ہیں۔ اور وہ ان سب خیالات و افکار کو اس میں جذب و پیوست بھی کر دینا چاہتا ہے۔ مجاز کی شاعری میں ایک فطری صلاحیت نظر آتی ہے جیسا کہ فیض احمد فیض نے مجاز کی شاعری کے بارے میں ''آہنگ'' کے دیباچہ میں کہا ہے کہ:

> ''مجاز کی شاعری انہیں تینوں اجزا کا مرکب ہے۔ (شمشیر، ساز اور جام) شمشیر کی صلابت اور ساز و جام کا گداز ہونا ضروری ہے۔''

فیض احمد فیض کی اس بات سے اتفاق بھی کرنا پڑتا ہے کہ مجاز شمشیر کو صرف مردوں کے ہاتھ میں اٹھانے کی باتیں نہیں کرتے بلکہ عورت کے ہاتھوں میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں یعنی شمشیر کے بہانے انقلاب لانے اور پورے سماجی ڈھانچے کو بدلنے کی باتیں

کرتے ہیں۔ مجاز کے ذہن میں جیسے ہی انقلاب کا تصور آتا ہے وہ عشق کی دنیا سے باہر نکل آتے ہیں جس کی عمدہ مثال یہ غزل ہے:

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا
اے شورشِ دوراں بھول گئے
وہ زلفِ پریشاں بھول گئے
وہ دیدۂ گریاں بھول گئے
اے شوقِ نظارہ کیا کہیے
نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوقِ تصوّر کیا کیجئے
ہم صورتِ جاناں بھول گئے
اب گل سے نظر ملتی ہی نہیں
اب دل کی کلی کھلتی ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں رخصت ہو
ہم لطفِ بہاراں بھول گئے

مجاز کی ابتدائی غزلوں میں ایک کلاسیکی رنگ و آہنگ نظر آتا ہے مگر جیسے جیسے ان کی غزل عروج کو پہنچتی ہے وہ جلد ہی لب و رخسار جام و زلف سے باہر نکل آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں زمانے کا بدلتا ہوا مزاج اور ایک معروضی کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے یعنی وہ اپنے محبوب کی صورت تک بھول جاتے ہیں۔ محبوب کی صورت بھول جانے کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ روزگارِ زمانہ دوسری انقلابِ زمانہ، یہ زندگی کی ایسی صورتیں ہیں جہاں کچھ بھی یاد نہیں رہ جاتا، مجاز کی یہ غزل مجاز کی زندگی کی تجرباتی غزل معلوم ہوتی ہے کیونکہ جس طرح مجاز عاشق مزاج اور طربِ ساز کے عادی تھے اور اس طرح کے اشعار کہہ رہے ہوں

جوغنائیت سے بھرپور ہے اس غزل کے دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

ابھی رہنے دے دل میں شوقِ شوریدہ کے ہنگامے
ابھی سر میں محبت کا جنونِ جام رہنے دے
ابھی رہنے دے کچھ دن لطفِ نغمۂ مستی صہبا
ابھی یہ ساز رہنے دے ابھی یہ جام رہنے دے

مجاز غزل میں جام لفظ جنون کے لیے استعمال کرتے ہیں وہ جام پی کر مدہوش نہیں ہوتے بلکہ جنون کی کیفیت کو اپنے ذہن پر طاری کرتے ہیں اور وہ ہوش و ہواس کے ساتھ رہ کر اُمید کی باتیں کرتے ہیں کیونکہ ساز سے وہ زندگی کو مترنم اور حرارت سے بھرپور دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس غزل میں ساز اور جام دونوں ہی موجود رہنے کی باتیں کرتے ہیں۔

مجاز ترقی پسند شاعر ہے اور وہ حقیقی چیزوں پر یقین رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے مجاز کی شاعری میں حقیقت پسندی اور ترقی پسندی کے عنصر کارفرماں نظر آتے ہیں۔ اور ان کا محبوب کوئی خیالی محبوب نہیں ہوتا بلکہ حقیقی محبوب نظر کے سامنے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ براہ راست اپنی محبوبہ کا نام لینے میں شرماتے نہیں بلکہ سچی حقیقت سے غزل میں متعارف بھی کراتے ہیں۔ مجاز کی غزلوں کا یہ نرالا اور انوکھا انداز خوب دیکھنے کو ملتا ہے۔

ہاں ذرا جرأت دکھا اے جذبۂ دل
حُسن کو پردے پہ اپنے ناز ہے

--

بتانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل
ہزار بار جہاں سے گذر چکا ہوں

--

میرے ہر لفظ میں بیتاب مرا سوزِ دروں
میری ہر سانس محبت کا دھواں ہے ساقی

غزل کے اس شعر میں آہ فغاں کی صورت نظر آتی ہے۔ کیوں کہ محبت کی سوزش سے دل میں جلن پیدا ہوتی ہے اور جب دل جلے گا تو دھواں بھی اُٹھے گا مگر فوراً ہی وہ طوفانِ زندگی میں مسکرانے کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

غزل میں مجاز کو یہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ وہ رونے کے علاوہ ہنسنے ہنسانے یعنی نا اُمیدی میں اُمید کی شمع کو روشن کرنے اور اس روشنی کی ہدایت پر ایماں حاصل کر کے حوصلہ اور ہمت کے ساتھ خود بھی آگے بڑھنے اور زمانے کو آگے بڑھانے کی باتیں کرتے ہیں۔ چونکہ ایک غزل میں وہ خود ہی کہتے ہیں کہ....

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

--

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

مجاز کی نظر میں دنیا کا سنورنا اتنا آسان نہیں ہے بہت مشکل ہے اور نہ ہی اس دنیا میں غم ہی غم ہے۔ بلکہ مسرت ہے خوشی ہے یاس اور نا اُمیدی کو چھوڑنا ہوگا۔ دنیا ایک آزمائش گاہ ہے جہاں خوشی اور غم ایک دوسرے کے ساتھ ازل سے بندھے ہوئے ہیں مگر انسان اپنی صلاحیتوں کی بنا پر غم کو انگیز کر کے اُس میں سے اُمید و نشاط کی رمق کو تلاش کرتا ہے اور اُسی کے سہارے زندگی گذارتا ہے۔ اور مجاز بھی اسی طرح کی زندگی جینے کے عادی تھے۔ مجاز کی زندگی میں بھی روزگارِ زمانہ کا بڑا دخل رہا۔ جس کی وجہ سے خراب صحبتوں میں پڑ کر وہ شراب کے عادی ہو چکے تھے۔ مگر باطنی طور پر وہ بھولے اور معصوم انسان تھے اسی

وجہ سے وہ اس گھیرے سے نکل نہیں پائے۔ آخر کار کم عمری ہی میں اُنہیں زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ان سب حالات کے باوجود وہ غزل میں غم کو گلے نہیں لگاتے بلکہ اُس میں جینے کا راستہ تلاش کر لیتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ مجاز آزمائشوں اور مصیبتوں سے پریشان تو ہوتے ہیں مگر رونے اور رُلانے پر یقین نہیں رکھتے بلکہ اس پریشانی سے دوچار ہو کر زمانے کو آگے بڑھانے اور خود کو آگے بڑھنے کی باتیں کرتے ہیں:

زمانے سے آگے تو بڑھیے مجاز
زمانے کو آگے بڑھانا بھی ہے

یہ شعر ترقی پسند فکر کی عمدہ مثال ہے۔ مجاز کی غزلوں میں بدلے ہوئے اقدار سیاسی، سماجی، رومانی، انقلابی گو فکر کی ہر سطح پر ایک نئی فضا کا احساس ہوتا ہے۔ ان سب کے باوجود مجاز کی غزلوں میں سادگی، شگفتگی، روانی، استعاراتی تراکیب کی خوبصورت بندشیں نظر آتی ہیں۔ مجاز نے اردو کی کلاسیکی شاعری سے الگ ہٹ کر منفرد، لب ولہجہ اور فکر و خیال کی وجہ سے اپنی فنکاری کے نئے جوہر بکھیرے ہیں۔ وہ غزل میں ایک نئی راہ نکالتے ہیں اور اسی راستے کو ہموار کر کے اپنی انفرادیت کا لوہا منوا لیتے ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے اپنی غزلیہ شاعری کے ذریعہ اردو غزل کو نئے نئے زاویے سے روشناس بھی کرایا اور غزل میں ایک نیا رنگ قائم کیا۔ مجاز کی غزلوں میں انہیں ساری خوبیوں نے انہیں اپنے معاصرین میں ایک منفرد انداز فکر کا شاعر بنا دیا۔ اور اپنے ہم عصروں میں انہیں سب سے زیادہ مقبولیت بھی حاصل تھی۔

انہوں نے کم عمر پائی، سرمایۂ شاعری بھی زیادہ نہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے غزل کے دامن کو وسیع کیا اور جو راستہ حسرت موہانی اور اختر شیرانی نے اپنایا تھا اس میں تازگی اور وسعت پیدا کی۔ کوئی مانے یا نہ مانے لیکن مجاز کا یہ مختصر شعری سرمایہ اُنہیں نہ صرف ترقی پسند شاعری میں ایک اہم مرتبہ عطا کرتا ہے بلکہ نئے دور کی پوری شعری تخلیقات پر اسے ایک محاکمہ حاصل رہے گا۔

ارمانوں اور مسرتوں کا شاعر اسرار الحق مجاز

مجاز ترقی پسند شاعر تھے۔ اور ایک ترقی پسند شاعر امیدوں اور آرزوؤں کا احساس جگاتا ہے۔ زندگی کی توانائیوں کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور انسانوں کے دُکھ درد کا مداوا تلاش کرتا ہے۔ مجاز نے بھی اپنی شاعری کے ذریعہ زندگی کی انھیں خوشگواریوں کے تانے بانے بنے ہیں۔ ''مزدور کا گیت''، ''نوجوان خاتون سے''، ''خواب سحر''، ''انقلاب''، ''سرمایہ داری'' اور ''اندھیری رات کا مسافر'' ایسی نظمیں اور متعدد غزلیں بھی، نہ صرف سماجی تبدیلی کی خواہشات کا فکری اظہار ہیں بلکہ غیر طبقاتی سماج کی تعمیر کا ارمان بھی ہیں۔

مجاز نے جذبے کو دور اسیر نہیں بلکہ جذبے کو دور آمیز کر کے اپنی شعری فکر میں ایک اور جہت کا اضافہ کیا اور یہ جہت سماجی انقلاب کی جہت ہے۔ یہی سبب ہے کہ نظام نو کے قیام کی تمنا مجاز کی شاعری میں نغمگی بن کر ابھری ہے۔ چنانچہ مجاز کو انقلاب کا مطرب و مغنی کہنا میرے خیال میں بالکل درست ہے۔ ''ترانۂ علی گڑھ'' جس نے مجاز کو حیات جاودانی عطا کی اس مستزاد کا اہم کارنامہ ہے۔ مجاز کو علی گڑھ نے اگر زندگی کا حسن اور زمانہ

شناسی دی تو مجاز کی علی گڑھ سے جذباتی وابستگی اور گہرے ربط کا عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی فنی وفکری جودت کا مظہر بھی ہے۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ نظم دانش گاہ علی گڑھ کا استعارہ بن گئی۔

مختلف صنعتوں کے برمحل استعمال سے اگر ایک سمت اس نظم کی فنی خوبیاں منور ہوتی ہیں، وہیں دوسری جانب قوم اور سماج سے متعلق مجاز کے نظریات بھی ابھرتے ہیں۔ جس طرح چمن اور بلبل کا کوئی رنگ، مذہب اور علاقہ نہیں ہوتا، اسی طرح یہاں آنے والے تمام اساتذہ، طلبہ بلکہ تفریق رنگ ونسل اور مذہب وملت اس چمن کی زینت ہیں۔

مزید برآں مجاز اپنے تجربات ونظریات کا بخوبی مظاہرہ کرتے ہیں تو اس کی وجہ لفظوں کے استعمال کا سلیقہ اور بیان کی وہ قوت ہے جو قدیم وجدید ادب سے ان کی شغف اور ان کی کما حصہ واقفیت سے پیدا ہوئی ہے۔

رواں، نغمہ باز، دلکش اور مترنم، غزل اور نظم پر یکساں قدرت مجاز کی اس تقریب و وابستگی کی دین ہے۔ پھر استعاروں اور تشبیہوں کے وسیلے سے روح عصر کو جس خوبی سے اشعار میں سمویا گیا ہے اس سے ان کی عصری آگہی کا بھی اندازہ ہوتا ہے اور ان کے تاریخی و سماجی شعور کا بھی۔

ان کی سب سے بہترین نظم ''آوارہ'' ہے۔ مجاز نے تاریخ کے جس محور پر یہ نظم لکھی تھی وہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہندوستان کے معاشرتی وسیاسی حالات تھے۔ یہ نظم اس عہد کا مرثیہ بھی ہے اور اس زمانے کا المیہ بھی۔ اس کی خوبصورت تشبیہات واستعارات اس کی نغمگی علامتیں اداسی اور امید کی ملی جلی فضا ایک عجیب کیفیت پیدا کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ فرمائیے:

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال

آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جن کا حال
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں
پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں
اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

''آوارہ'' ہر دور کے نوجوانوں کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ نظم زخمی دلوں کی صدائے احتجاج ہے۔ ایک نوجوان جو حالات کے جبر کا شکار ہے اور سب کچھ اجڑ جانے کے بعد ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے۔ اس کے اندر ایک جھلاہٹ ہے، ایک وحشت ہے، دل غم سے چور ہے۔ دراصل یہ نظم نہ صرف مجاز کی بلکہ اردو زبان کی چند بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔

اس نظم میں پوری ایک نسل کا اضطراب بند ہو گیا ہے۔ اس نظم کا عنوان ''آوارہ'' احساسِ فکر کی پوری ایک کائنات لئے ہوئے ہے۔ غرض کہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ نظم ہمارے عہد کے منظرنامے پر پوری اترتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ''رات اور ریل'' جیسی منظری نظم لکھنے والا شاعر جب قدرت کے حسین مناظر کی پیکر تراشی کرتا ہے تو قاری انھیں وادیوں میں خود کو نہ صرف محسور پاتا ہے بلکہ شاعر کے ساتھ وہ بھی اسرار و کائنات کا متلاشی ہو جاتا ہے۔ اسرار کا استعاراتی انداز ان کی شاعری کا خاصہ ہے۔ اس نظم کا ایک بند ملاحظہ فرمائیں:

چھیڑتی اک وجد کے عالم میں ساز سرمدی
غیظ کے عالم میں منہ سے اگ برساتی ہوئی
اگے۔اگے جستجو آمیز نظر ڈالتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی
ایک اک حرکت سے انداز بغاوت آشکار
عظمت انسانیت کے زمرے گاتی ہوئی

اس نظم میں جس انداز سے اسرار کائنات کے رموز واسرار کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، یہ مجاز کا ہی حصہ ہے۔ان کی شاعری میں جو ترنم، لہجے کی شیرینی ہے وہ مجاز کو بہت دور لے جاتی ہے۔اسی طرح ''نوجوان خاتون سے'' ان کی ایک بہت اچھی نظم ہے۔مجاز نے دو نظمیں ایسی لکھی ہیں جس میں ایک میں انھوں نے اپنے عہد کے نوجوانوں کو مخاطب کیا ہے اور دوسرے میں خواتین کو۔اس نظم میں مجاز نے عورت کے بارے میں ان کے تصور اور زندگی کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر کو ظاہر کیا ہے۔نوجوان خاتون سے وہ کہتے ہیں:

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنالیتی تو اچھا تھا

آنچل کو پرچم بنانے کا مطالبہ ایک رومانی طریقۂ اظہار ہے۔اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ نوجوان عورت اپنے نسائی وجود کو ختم کر کے اپنے آپ کو مردانہ صفات میں ضم کرلے بلکہ مجاز اس عورت میں اس شعور کی کارفرمائی دیکھنا چاہتا ہے جس کی بدولت وہ اس قابل ہو جائے نسوانیت زن کا نگہبان ہے۔فقط مرد کا طعنہ اسے نہ سننا پڑے۔

مجاز کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عورت کو جو مقام اور وقار اس شہید محبت نے عطا کیا اس کی مثال اردو شاعری میں اور کہیں نہیں ملتی۔یہ شرف صرف اور صرف اسرار الحق مجاز کو حاصل ہے۔نظم ''نذر علی گڑھ'' کا تعلق علی گڑھ جیسی مادری علمی درسگاہ سے ہے۔اس نظم میں سرشاری وسرمستی کی جو کیفیت ہے اس کا اندازہ ان اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

سرشار نگاہ نرگس ہوں پابستہ گیسوئے سنبل ہوں
یہ میرا چمن ہے میرا چمن میں اپنے چمن کا بلبل ہوں
ہر آن یہاں صہبائے کہن اک ساغر نو میں ڈھلتی ہے
کلیوں سے حسن ٹپکتا ہے پھولوں سے جوانی ابلتی ہے
جو طاقِ حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے
اس دشت کے گوشے گوشے سے اک جوئے حیات ابلتی ہے
اسلام کے اس بت خانے میں اصنام بھی ہیں اور آذر بھی
تہذیب کے اس میخانے میں شمشیر بھی ہے اور ساغر بھی
ہر شام ہے شام مصر یہاں ہر شب ہے شب شیراز یہاں
ہے سارے جہاں کا سوز یہاں اور سارے جہاں کا ساز یہاں
جو ابر یہاں سے اٹھے گا وہ سارے جہاں پر برسے گا
ہر جوئے رواں پر برسے گا ہر کوہِ گراں پر برسے گا

مذکورہ بالا اشعار اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ علی گڑھ سے مجاز کو اور مجاز کو علی گڑھ سے کتنی عقیدت و محبت تھی۔

مجاز کے یہاں غنائیت کا ایسا عمل نظر آتا ہے جو مجاز کو اپنے دور کے دوسرے شعراء سے ممیز کراتی ہے۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی:

> ''مجاز کی غنائیت میں چشمے کی روانی، شادابی اور عنفوان شباب کی وارفتگی اور والہانہ پن ملتا ہے۔ مجاز کے کلام کو فکر وفن کے اعلیٰ معیار پر جانچا جائے تو شاید اس میں گہرائی اور تفکر نہ ملے جو ادب میں عظمت اور بلندی کا ضامن ہوتا ہے لیکن ان کے کلام کی غنائیت اور اس کی شادابی و شگفتگی ہمارے حواس کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتی رہے گی۔''

مجاز کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اس طرح نظموں میں بھی نغمگی اور غنائی آہنگ کو برقرار رکھا ہے۔ ان کی نظم ''آہنگ نو'' سے مندرجہ ذیل بند ملاحظہ فرمایئے:

اے نوجوانان وطن روح جواں ہے تو اٹھو
آنکھ اس محشر نو کی نگراں ہے تو اٹھو
خوب بے حرمتی و فکر زیاں ہے تو اٹھو
پاس ناموس نگارانِ جہاں ہے تو اٹھو
اٹھو نقارۂ انقلاب بجا دو اٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو اٹھ کر

اسی غنائیت کی وجہ سے مجاز کے شعروں میں تھکن نہیں مستی ہے۔ اداسی نہیں سرخوشی ہے۔ اس لئے یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مجاز انقلاب کا ڈھنڈھورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے۔

اسرارالحق مجاز نظم گو شاعر کی طرح مشہور ہیں مگر ان کے غزلوں کا ذخیرہ بھی کافی ہے اور نظم ہو یا غزل دونوں میں زبان بیک وقت رنگین اور روزمرہ کے اظہار کا البیلا پن ہے جو سننے والوں کے دل میں اتر جاتی ہے۔ ان کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا اے سورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے وہ دیدہ گریاں بھول گئے
اے شوق نظارہ کیا کہیئے نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے فصلِ بہاراں ہو رخصت ہم لطف بہاراں بھول گئے

--

کیا کیا ہوا ہے ہم سے جنوں میں نہ پوچھئے
الجھے کبھی زمیں سے کبھی آسماں سے ہم

ٹھکرا دیئے ہیں عقل و خرد کے صنم کدے
گھبرا چکے تھے کشمکش امتحاں سے ہم
ہائے انجام اس سفینہ کا
ناخدا نے جسے ڈبویا ہے

مجاز کی شاعری میں ابتدا سے ہی پیغام عمل اور فرسودہ و جارحانہ غیر ملکی حکومت سے سرکشی اور بغاوت کے آثار نمایاں تھے۔ اپنی عشقیہ شاعری میں قلبی واردات اور احساسات کو دلکش و موثر انداز میں پیش کیا۔ ان کی انقلابی شاعری اور قومی شاعری موضوعات پر نظمیں ہماری تحریک آزادی امنگوں اور ولولوں سے سرشار ہیں۔

عورت مجاز کی شخصیت اور شاعری کا محور بھی ہے اور اس کی بہت بڑی محرومی اور تشنگی بھی۔ لیکن مجاز کی شاعری میں شرمندگی نہیں ملتی۔ یہ اشعار ملاحظہ فرمایئے:

عشق ہی عشق ہے دنیا میری
فتنۂ عقل سے بیزار ہوں میں
نشۂ نرگس خوباں مجھ سے
غازۂ عارض و رخسار ہوں میں
لے کے نکلا ہوں گہر ہائے سخن
ماہ و انجم کا خریدار ہوں میں
اہل دنیا کے لئے ننگ سہی
رونق انجمن یار ہوں میں

مندرجہ بالا اشعار اس کی محبت کو عبادت بناتی ہے۔ وہ ایک کارنامے کی طرح اپنی داستان سناتا ہے اور فخر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظمیں پڑھ کر اس کے عشق پر ترس نہیں آتا بلکہ رشک ہوتا ہے۔

ان کی یہی فطری صلاحیتیں ہمیشہ ان کو اور ان کی شاعری کو جوان رکھتی ہیں۔ ان کا کلام رنگین و مجروح جوانی کا نمونہ رہتا ہے کیونکہ ان کے پہلے میں ایک ایسا دل تھا جو جوانی کا مرقع تھا۔ جوان کے کلام پر تازگی و تاثر کی بارش کرتا رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے کلام کے لحاظ سے ہر عہد میں جوان رہتے ہیں۔ بقول احتشام حسین:

> ''مجاز نے اس کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ شاعری میں تازگی، گرمی اور اثر محض تجزیوں سے نہیں خلوص، مقصد کی عظمت، الفاظ کے فنکارانہ صرف اور فنی روایات کے تخلیقی استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے مجاز کی شاعری چاہے عظیم نہ ہو، پر اثر، پر سحر اور پر کار ضرور ہے۔ یہی چیز انھیں اردو کا مقبول اور جوانوں کا محبوب شاعر بناتی ہے۔''[1]

مجاز کی غزلیہ شاعری میں غنائیت کے ساتھ رومانی احساسات و خیالات اور تعمیری انقلاب کی دھوپ چھاؤں بھی ہے اور نشاطیہ عناصر کی ایک الگ کیفیت بھی۔ یہ نشاطیہ انداز ہی ہے کہ ان کی غزلیں سجی سجائی نظر آتی ہیں اور ان سے ایک ایسی آواز سنائی دیتی ہے جو ہمارے ذہنوں کو تر و تازہ کر دیتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مجاز اپنے عشق و محبت کے جذبے کو انقلاب کے نغمے میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس سے مجاز کی رومانیت میں ایک طرح کی صحت مندی اور زندگی کی قدروں کا احساس ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مجاز کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے آل احمد سرور اپنے مضمون ''مجاز رومانیت کا شہید'' میں لکھتے ہیں:

> ''مجاز کی زندگی اور شاعری میں رومانیت کی ہر لہر ملتی ہے۔ مجاز کی رومانیت میں جو جاندار صحت منداور باشعور حصہ ہے اس کی قدر و قیمت مستقل ہے۔ لیکن اس کی

پوری شاعری بھی بصیرت وعبرت کا سامان رکھتی ہے۔''[1]

بہر کیف مجاز کی شاعری میں جو نفاست، نغمگی، سوز، تڑپ اور بات کو دل نشیں بنا کر کہنے کا سلیقہ ملتا ہے وہی در حقیقت اس کے فن کی حقیقی خوبی ہے۔ وہ فنکار یقیناً ادبی قدر و ستائش کے مستحق ہیں جن کی آواز پر زمانہ یہ کہہ اٹھے:

''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے''

فرحت زہرا

مجاز۔ رومانیت اور انقلاب کا مطرب

مجاز ترقی پسند شعراء کی فہرست میں رومانی اور انقلابی شاعر کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کرنے والے سب سے اہم شاعر ہیں۔ ان کی شہرت اور مقبولیت کا سبب ان کی رومانی نظموں کے علاوہ ان کی انقلاب پرور رومانی شخصیت ہے، جو ان کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ مجاز کی شخصیت اور شاعری کے مطالعے سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ ان کا احساس حسن وطرب ہے۔ ان کا یہ احساس زمان ومکان کی حدود پھلانگ کر پرسوز اور مترنم لہجہ اختیار کرتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور انقلابی روح کا گداز ان کی شاعری میں تسلسل کے ساتھ قائم رہتا ہے، یہی وہ خوبیاں ہیں جو مجاز کے کلام کو حیات ابدی عطا کرتی ہیں۔ مجاز کی شاعری میں تازگی پوری آب وتاب کے ساتھ نظر آتی ہے۔ مگر ان کی شاعری کی یہ آب و تاب ان کی بے وقت موت نے بام عروج پر پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دی۔

مجاز میں ترقی پسند رجحانات کی لہر علی گڑھ سے شروع ہوئی اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کا جزو لاینفک بن گئی۔ انہوں نے اپنی شاعری کی اساس اس ترقی پسند

ادب پر رکھی۔ جس وقت انہوں نے ترقی پسند ادب پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی اس وقت مجاز کی شاعری اپنے ابتدائی دور سے گزر رہی تھی۔ پھر بھی ان کی ترقی پسند فکر اور ان کا جمالیاتی ذوق متوازی طور پر ساتھ ساتھ رہے۔ اُس دور میں مجاز جن شعرا سے متاثر تھے ان کے متعلق سردار جعفری لکھتے ہیں۔

''جوش کی رندی اور بے باکی، اختر شیرانی کی معصومیت اور رنگینی اور حفیظ کی نغمگی نے اسے متاثر کیا تھا۔ اور جب اس رندی اور بے باکی، معصومیت اور رنگینی اور نغمگی نے مجاز کی شاعری میں تحلیل ہوکر ایک نیا روپ اختیار کیا تو ترقی پسند تحریک کے ابتدائی دور کی سب سے حسین شاعری پیدا ہوئی۔''[۳]

مجاز کی شاعری پر ابتدائی دور میں رومانی کیفیت چھائی رہی جس کے سبب وہ بحرِ غزل کے تموج سے کھیلتے رہے۔ مثال کے طور پر ان کی شاعری کے ابتدائی نمونے ملاحظہ ہوں:

تیرے گناہ گار گنہ گار ہی سہی
تیرے کرم کی آس لگائے ہوئے تو ہیں
آنکھ سے آنکھ جب نہیں ملتی
دل سے دل ہم کلام ہوتا ہے
یہ مرے عشق کی مجبوریاں معاذ اللہ
تمہارا راز تمہیں سے چھپا رہا ہوں میں
سچ تو یہ ہے مجاز کی دنیا
حسن اور عشق کے سوا کیا ہے

مجاز کی مقبولیت کا راز ان کی خوشگوار اور رومانی نظموں میں پوشیدہ ہے۔ اسی لئے

ان کے مزاج کی مناسبت سے ان کی نظموں میں جام و مینا، تیغ و سینا، حسن و نغمہ سب کی آمیزش نظر آتی ہے۔ مجاز کی ان ہی خوبیوں کی بدولت اثر لکھنوی نے انہیں اردو شاعری کا کیٹس قرار دیا ہے۔ حسن و عشق اور نشاط و گداز کا یہی رنگ ان کی نظموں کو نیا رنگ و آہنگ، نیا اسلوب، نئی تازگی اور رنگینی عطا کرتا ہے۔ بقول اسلوب احمد انصاری:

> ''ان کی شاعری کے خط و خال کی تشکیل ایک رچے اور نکھرے رومانی نقطۂ نظر اور افتادِ طبیعت سے ہوئی ہے ان کا کلام سرتاپا اسی شگفتگی و سرمستی جذب و کیفیت اور وفور وارفتگی میں ڈوبا ہوا ہے۔''

نظم ''آوارہ'' ایک طرف تو مجاز کے رومانی طرزِ احساس کی مظہر اور رومانی تصورات کی آئینہ دار ہے تو دوسری طرف مجاز کی فنی ہنرمندی کو بھی نشان زد کرتی ہے۔ اس ضمن میں ان کی اسی نظم سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

شہر کی رات میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی، جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں
یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے، کون سمجھے جی کا حال
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں
پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی

ہوک سی سینے میں اٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

رومانیت مجاز کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں رومانیت کا بہت حسین اور رچا ہوا احساس ملتا ہے۔ جب وہ رومانی نغمے گاتے ہیں تو اپنے تخیل کی پیدا کردہ حسین دنیا کی منظر کشی کچھ اس انداز سے کرتے ہیں کہ ان کی شاعری، اردو شاعری کی لطافت و نزاکت سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتی ہے اور وہ رومانی شاعری کے دائرے میں رہ کر بھی اپنی تہذیب کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ مثلاً:

مری خودداریوں کا خون نہ کر
مطرب بزم دل براں نہ بنا
ماہ و انجم سے مجھ کو کیا نسبت
مجھ کو ان کا مزاج داں نہ بنا
میری جانب نگاہِ لطف نہ کر
غم کو اس درجہ کامراں نہ بنا
میری ہستی نیاز و شوق سہی
اس کو عنوانِ داستاں نہ بنا

مجاز کی رومانی شاعری میں حقیقت کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے۔ اس لیے ان کی نظمیں اور غزلیں نئے دور کے نئے تقاضوں کی ترجمان بن گئی ہیں۔ ان کی ابتدائی دور کی نظمیں خاصی رومانی ہیں۔ ان میں ''کسی سے محبت''، ''ایک غمگین یاد''، ''جشنِ سالگرہ''، ''آوارہ'' وغیرہ شامل ہیں۔ بہ ظاہر یہ نظمیں سیدھی سادی ہیں لیکن ان کی رومانیت میں بڑی حد تک کیف اور دل آویزی موجود ہے۔ جو ان کے تخیل کو اور زیادہ پُر اثر بنا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم ''کس سے محبت ہے'' سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ میرے آسماں پر اخترِ صبحِ قیامت ہے
ثریا بخت ہے، زہرہ جبیں ہے، ماہ طلعت ہے
مرا ایماں ہے مری زندگی ہے، مری جنت ہے
مری آنکھوں کو خیرہ کر گئیں تابانیاں اس کی

مجاز کی رومانی خصوصیت ان کی نظم ''آج کی رات'' میں بھی پوری طرح نمایاں ہے:

محوِ گلگشت ہے یہ کون میرے دوش بہ دوش
کہکشاں بن گئی ہر راہ گذار آج کی رات
پھوٹ نکلا در و دیوار سے سیلابِ نشاط
اللہ اللہ مرا کیفِ نظر آج کی رات
شبنستانِ تجلی کا فسوں کا کہیے
چاند نے پھینک دیا رختِ سفر آج کی رات
نور ہی نور ہے کس سمت اٹھاؤں آنکھیں
حسن ہی حسن ہے تاحدِ نظر آج کی رات
مذہب عشق میں جائز ہے یقیناً جائز
چوم لوں میں لبِ لعلیں بھی اگر آج کی رات

نظم ''آج کی رات'' میں ان کا شعری جہان فکری اور جمالیاتی ذوق دونوں اعتبار سے بہت وسیع ہے۔ اس نظم میں خوبصورت الفاظ اور دلکش تراکیب بہ درجہ اتم موجود ہیں۔ مجاز زبان اور الفاظ کے استعمال کے معاملہ میں ہمیشہ محتاط رہے ہیں۔ مجاز کی یہی خوبی ہے کہ ان کی رومانی شاعری صرف اظہار عشق و محبت کی شاعری نہیں ہے بلکہ وہ لطافت، حسن اور خوبصورتی کی شاعری ہے۔ بقول علی سردار جعفری:

مجاز کی شاعری میں شروع سے آخر تک نشاط ہی نشاط ہے وہ

خود اس نشاط میں ڈوب جانا چاہتا ہے اور اپنے ساتھ ساری دنیا
کو غرق کر کے مدہوش کر دینے کی فکر میں ہے۔ اس کے یہاں غم
بھی شعر کا جامہ پہن کر ایک نشاط اور کیفیت پیدا کرتا ہے۔''

اپنی جن نظموں اور غزلوں میں مجاز ایک نئے عشقیہ لہجے کے ساتھ سامنے آتے ہیں وہ ''طفلی کے خواب''، ''نورا''، ''نذرِ دل''، ''کس سے محبت ہے''، ''آج کی رات'' وغیرہ نظمیں ہیں۔ ان نظموں میں غنائیت اور جذباتیت تو موجود ہے لیکن ان کی یہ عشقیہ شاعری سطحی لذتیت سے پاک وصاف ہے۔ بقول اختر انصاری:

''وہ ایک تندرست اور صالح حسن پرستی کا ثبوت ضرور دیتی ہے
لیکن رکیک عشق بازی اور بیمارانہ لذت پسندی کے اثرات سے
بالکل پاک ہے۔''

ان کے اشعار نئے احساس وشعور کے ترجمان ہونے کے بعد جدت سے بھرپور ہیں۔ بقول احتشام حسین رومانیت مجاز کو ترقی سے روکنے والا عنصر نہیں پر پرواز عطا کرنے والا عنصر بن جاتا ہے۔ احتشام حسین مجاز کے فکر وفن سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مجاز کی ابتدائی شاعری کی رومانیت آہستہ آہستہ انقلابی
رومانیت میں تبدیل ہو رہی تھی، اس نے مجاز کو گرفتار نہیں رکھا،
بلکہ ان کے جوش اور ولولہ کو مہمیز کرتی رہی۔''

الغرض مجاز کے یہاں لطافت، شیرینی، اندازِ بیان، روانی اور بے ساختگی مسحور کن درجے تک ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مجاز جو رومانیت اور انقلاب کا مطرب ہے وہ کائنات کی حسین لطافتوں اور اس کی وادیوں میں اپنے حسین تخیل کے سہارے زندگی کی شیرینیوں کا جویا ہے اس میں ان کے جذبات کا خزانہ اور احساس کی شدت موجود ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن شعر نو میں رقم طراز ہیں:

''مجاز کی شاعری تازہ دم اور شگفتہ مزاج حسن پرست کی شاعری ہے۔ جس نے زندگی اور اس کی خوبصورت چیزوں سے پیار کیا.... مجاز کی رومانی شاعری خاص طور پر بڑی صحت مند اور تابناک ہے۔ اس میں شکست کے آگے سر جھکانے کے بجائے فتح و کامرانی کے عزم کو مضبوط کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ ان کی نظموں میں زندگی سے محرومی کے باوجود اس سے گہری وابستگی ہے۔ وہ انہیں اس دور کے تمام تر نوجوان شعرا میں ممتاز کرتی ہے۔''

ابتدا میں مجاز کی شاعری پر رومانی رنگ غالب تھا۔ لیکن ۱۹۲۳ء کے آس پاس ان کی شاعری کا مزاج بدلنے لگا اور بدلتے ہوئے نظام کی اقدار نے انہیں بھی انقلابی شاعر بنا دیا۔ اسی لیے وہ سوز و ساز و ترنم اور رقص و نغمہ کے ساتھ ساتھ انقلابی شاعر بن گئے۔ جہاں انہوں نے بھی مزدوروں اور سماج کے دبے کچلے لوگوں کے گیت گائے۔ مجاز اپنی شاعری میں جذبات اور انقلاب کی لے میں بہہ کر صرف نعرہ بازی ہی نہیں کرتے بلکہ وہ انقلاب کے مطرب نظر آتے ہیں۔ فیض احمد فیض آہنگ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''مجاز انقلاب کا ڈھنورچی نہیں۔ انقلاب کا مطرب ہیں۔ اس کے نغموں میں برسات کے دن کی سی سکون بخش خنکی ہے، اور بہار کی رات کی سی گرم جوش تاثر آفرینی۔''

۱۹۳۳ء میں ان کی مشہور نظمیں ''رات اور ریل'' اور ''انقلاب'' جیسی نظمیں ان کے قلم سے نکل کر منظر عام پر آئیں۔ نظم ''رات اور ریل'' میں کہیں کہیں استعاراتی انداز میں انہوں نے انسانی وجود اور زندگی کے مقاصد کی بھرپور انداز میں ترجمانی کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

چھیڑتی اک وجد کے عالم میں ساز سرمدی
غیظ کے عالم میں منہ سے آگ برساتی ہوئی

آگے آگے جستجو آمیز نظریں ڈالتی
شب کے ہیبت ناک نظاروں سے گھبراتی ہوئی

مجاز نے انقلابی شاعری سے انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو پیش کر کے زندگی کی نئی تبدیلیوں کی وضاحت کی ہے۔ ان کی انقلابی شاعری ایک منفرد مزاج کی مالک ہے جو ان کے اشعار میں ہمہ وقت نظر آتی ہے۔ نظم ''اِدھر بھی آ'' کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

تقدیر کچھ ہو کاوشِ تدبیر بھی تو ہے
تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے
آ منتظر ہے عشرتِ فردا ادھر بھی آ

مجاز کا ایک خاص وصف یا اسے شاعری کا ہنر بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے انقلابی لب و لہجہ کو عوامی رنگ و آہنگ دے کر اسے اور پر لطف بنا دیتے ہیں۔ مثلاً:

بول اری او دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانواڈول
بادل، بجلی رین اندھیاری
دکھ کی ماری پرجا ساری
بوڑھے بچے سب دکھیا ہیں
دکھیا نر ہے دکھیا ناری
بستی بستی لوٹ مچی ہے
سب بنئے ہیں سب بیوپاری
منزل اپنے پاؤں کے نیچے
منزل سے اب دور نہیں ہم

یہی بنیادی وصف ہے کہ شاعری میں انہوں نے سادہ اور عام موضوع میں بھی اپنے جذبہ اور وجدان کو اپنے آپ سے الگ نہیں ہونے دیا۔ مجاز کی انقلابی شاعری کی اپنی ایک الگ شعریات ہے۔ فیض احمد فیض لکھتے ہیں:

> ''مجاز کی انقلابیت تمام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے۔ عام انقلابی شاعر انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے ان کے ذہن میں آمد اور انقلاب کا تصور طوفان، برق و رعد سے مرکب ہے وہ صرف انقلاب کی ہولنا کی کو دیکھتے ہیں۔''

مجاز کی شاعری میں بدلتے ہوئے اقدار کی سیاسی، سماجی، رومانی، انقلابی ہر سطح پر ایک نئی فضا اور ایک نئی لے کے ادراک کا احساس ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں سادگی، شگفتگی، روانی، استعاراتی تراکیب کی خوبصورت بندش نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک طرح کی نرمی اور رکھ رکھاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ تاہم مجاز ترقی پسند شاعری کے ساتھ اپنے خاص مجازی رنگ و آہنگ کے ساتھ نمودار ہوئے۔ ''نمائش'' اور ''صبح بہار'' جیسی روایتی نظموں سے ہٹ کر جلد ہی ''انقلاب'' جیسی نظم کہتے ہیں۔ ''رات اور ریل''، ''نذر علی گڑھ''، ''نذر خالد''، ''اندھیری رات کا مسافر''، ''سرمایہ داری'' سے لے کر ''آوارہ'' تک مجاز نے اپنی ہر نظم میں رومانی لیکن گہرے سماجی شعور اور انقلابی ذہن کا پتہ دیتے ہیں۔ اس ضمن میں آل احمد سرور کہتے ہیں کہ ''نمائش، اور صبح بہار لکھنے والا انقلاب کا نقیب بن گیا۔''

بہر حال وہ اپنی انقلابی شاعری کے ذریعہ کج کلاہ نوجوانوں کو نیا راستہ تلاش کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ مجاز کی ان انقلابی نظموں میں نوجوان سے اور نوجوان خاتون وغیرہ میں انقلاب اپنی نئی جہتوں میں نظر آتا ہے۔ جنہوں نے انقلاب کو سیاسی معنوں سے الگ ہٹ کر تہذیبی، سماجی لے میں استعمال کیا۔ مثال کے طور پر نظم ''نوجوان سے'' کے چند

اشعار ملاحظہ کیجیے:

جلال آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر
ترے خرام میں ہے زلزلوں کا راز نہاں
ہر ایک گام پر اک انقلاب پیدا کر
سکون خواب ہے بے دست و پا ضعیفی کا
تو اضطراب ہے خود اضطراب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

مجاز کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ مستقبل نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے وہ انقلاب کی آمد کا انتظار کرنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ انقلاب پیدا کرنے کے قائل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انقلاب کی آمد کا انتظار کرنے کے بجائے وہ انقلاب پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں سچائی اور فکر کا گہرا احساس نظر آتا ہے۔ نظم ''آوارہ'' اپنے انقلابی لب ولہجہ کے ساتھ خوبصورت استعاروں اور حسین تراکیب کی نظم ہے جس میں انہوں نے انقلاب کو رومانی انداز میں بیان کیا ہے۔ شاعری میں احساس اور وجدان کا رشتہ ہوتا ہے وہ ایمان ایقان کو بنیاد میں رکھتا ہے۔ مجاز کی شاعری کا بنیادی جوہر یہی ہے کہ انہوں نے سادہ اور دلکش انداز میں اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی انقلابی پیرائیہ اظہار کے ساتھ کی ہے۔ بقول فیض احمد فیض:

''مجاز کی انقلابیت عام انقلابی شاعروں سے مختلف ہے۔
انقلابی شاعری انقلاب کے متعلق گرجتے نہیں للکارتے
ہیں۔ سینہ کوٹتے ہیں۔ انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے یہ.... یہ

انقلاب کا ترقی پسند نہیں رجعت پسند تصور ہے۔''

غرض مجاز کے یہاں لطافت، شیرینی، انداز بیان روانی اور بے ساختگی مسحور کن درجہ تک ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مجاز جو رومانیت اور انقلاب کا مطرب ہے وہ کائنات کی حسین لطافتوں اور اس کی وادیوں میں اپنے حسین تخیل کے سہارے زندگی کی شیرینیوں کا جویا ہے جو ان کے جذبات کا خزانہ اور احساس کی شدت کی شکل میں موجود ہے۔

شاعر کے لیے جو چیز اہم اور ضروری ہوتی ہے وہ اس کا اسلوب اور طرز ادا ہے، جس کو مجاز نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے وقت بخوبی برتا ہے۔ شعر وسخن میں ان کے یہاں تشبیہیں، استعارے اور کنایہ کا استعمال بہت ہی موثر انداز میں کیا گیا ہے۔ کیونکہ تشبیہیں، استعارے ہی بلاغت کا زیور ہوتے ہیں اور بلاغت ہی کلام کا اصل حسن ہوتا ہے۔ نظم ''رات اور ریل'' اس کی عمدہ مثال ہے۔

مجاز انقلابی شاعری کے دلدادہ ہونے کے باوجود بنیادی طور پر رومانی شاعر تھے۔ بہر حال یہ ان کی انفرادیت ہے کہ عشقیہ شاعری ہو یا سماجی احتجاجی یا انقلابی ہر مقام پر نشاط اور طرب موجود ہے۔ انقلاب میں غم وغصہ، للکار و پکار کے عناصر زیادہ ہوا کرتے ہیں لیکن مجاز نے جس نوع کی اضطرابی واحتجاجی شاعری کا آغاز کیا ہے بالکل مختلف ہے۔ یوں تو مجاز انقلاب کا نعرہ ۱۹۳۳ء میں بلند کر چکے تھے۔ نظم ''رات اور ریل' اور ''اندھیری رات کا مسافر'' میں رومان کے ساتھ ساتھ انقلاب کی جھلکیاں علامتی طور پر ملتی ہیں۔ مجاز کا شعری کمال انقلابی نظموں میں اپنا خاص جوہر دکھاتا ہے۔ اس نوع کی نظموں میں ان کی تخلیقی ہنرمندی زیادہ فنکاری کے ساتھ اجاگر ہوتی ہے۔ وہ انقلابی تصور میں بھی رومان کا پہلو شامل کر کے نظموں میں غنائی حسن شامل کرنے میں کامیاب رہے۔ مثال کے طور پر:

آؤ مل کر انقلاب تازہ پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

رضا حیدر

مجاز کا تصورِ انقلاب

اگر ہم ترقی پسند شاعری کی بات کریں تو مجاز کی شاعری کو اُن کے عہد میں بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ فیض نے مجاز کو انقلابی شاعر کہا، آل احمد سرور نے انہیں رومانی شاعر کہا اور بقول عزیز احمد ''مجاز کی شاعری انقلاب اور تغزل کا حسین امتزاج ہے''۔ مجاز کی شاعری پر احتشام حسین کے نقطۂ نظر کی بھی خاصی اہمیت ہے وہ کہتے ہیں:

> ''مجاز نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ شاعری میں تازگی، گرمی اور اثر محض تجربوں سے نہیں، خلوص، مقصد کی عظمت، الفاظ کے فنکارانہ اور فنی روایات کے تخلیقی استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے مجاز کی شاعری چاہے عظیم نہ ہو۔ پُر اثر اور پُر سحر ضرور ہے۔ یہی چیز انہیں اردو کا مقبول اور جوانوں کا محبوب شاعر بناتی ہے۔''

مجاز کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جوش کی پیروی کی اور یہی چیز انہیں انفرادی حیثیت کا مالک بناتی ہے۔ اُس وقت کے شعری منظرنامے میں جوش اپنی شاعری

کے ذریعے اپنی موجودگی کا احساس دلوا رہے تھے۔ نوجوان شعراء جوش کی شاعری سے کافی متاثر تھے۔ ان شعراء میں مجاز سب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں، کیونکہ مجاز کے سامنے بھی وہی مقاصد اور موضوعات تھے جو جوش کے سامنے تھے۔ مجاز کے کلام میں سماجی اور سیاسی شعور پورے آب وتاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی شاعری میں اس بات پر بھی اصرار کرتے ہیں کہ موجودہ نظام میں کئی خرابیاں ہیں موجودہ نظام صحیح قدروں پر قائم نہیں ہے اور وہ اس نظام کو انقلاب برپا کر کے بدلنا چاہتے ہیں، ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں
مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ بھی حقیقت ہے کہ مجاز نے اپنے ابتدائی دور میں رومانی نظمیں کہیں لیکن جب مجاز کے شعور میں پختگی آئی اور انہوں نے زمانے کے بدلتے مزاج کو دیکھا تو وہ اپنے آس پاس کے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مجاز نے وقت کی ضرورت کو محسوس کیا اور اپنی شاعری کو ملک کی تحریکِ آزادی سے جوڑ دیا۔ ان تمام باتوں کے باوجود مجاز اپنے انقلابی اور باغیانہ خیالات میں رومانی لب و لہجے کا استعمال کرتے ہیں۔ اُن کی نظم ''نذرِ دل'' کا یہ بند آپ کی خدمت میں ہے۔

تم کہ بن سکتی ہو ہر محفل میں فردوسِ نظر
مجھ کو یہ دعویٰ کہ ہر محفل پہ چھا سکتا ہوں میں

آؤ مل کر انقلابِ تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

اُن کی ایک اور نظم ''نوجوان خاتون سے'' کا یہ بند بھی اُن کی اس فکر کی وضاحت کرتا ہے۔

سنانیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامانِ جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
اثر باقی نہیں مفلوج پیروں کی دعاؤں میں
جوانانِ بلا کش کی دعا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مجاز کی اِن ہی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک جگہ فیض احمد فیض فرماتے ہیں:

''عام انقلابی شعرا انقلاب کے متعلق گرجتے ہیں، للکارتے ہیں، سینہ کوٹتے ہیں، انقلاب کے متعلق گا نہیں سکتے۔ اُن کے ذہن میں عام طور پر انقلاب کا تصور طوفانِ برق و رعد سے مرکب ہے۔ نغمۂ ہزار اور رنگینیٔ بہار سے عبارت نہیں۔ یہ انقلاب کا ترقی پسند نہیں رجعت پسند تصور ہے۔ یہ برق و رعد کا دور مجاز پر بھی گذر چکا ہے۔ لیکن اب مجاز کی غنائیت اسے اپنا چکی ہے۔ مجاز انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں انقلاب کا مطرب ہے۔''

مزدور اور دبے کچلے عوام کی سربلندی کی آرزو مجاز کی شاعری کے اہم موضوعات میں سے ہیں۔ جب وہ کسی مظلوم پر ظلم ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اُن کے اندر کا انقلابی آہنگ فوراً جاگ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اُن کا یہ بند آپ کی خدمت میں ہے جس میں مجاز نے انقلاب کا ایک خون آلود منظر پیش کیا ہے۔

جھونپڑوں میں خوں، محل میں خوں، شبستانوں میں خوں
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں
پرسکوں صحرا میں خوں، بے تاب دریاؤں میں خوں
دیر میں خوں، مسجدوں میں خوں، کلیساؤں میں خوں
خون کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں
ڈوب جائیں گی چٹانیں خون کے طوفان میں

مجاز کے تصورِ انقلاب سے متعلق محترم عابد سہیل منظر سلیم کی کتاب ''مجاز سیات اور شاعری'' کے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں۔

مجاز کے تصور انقلاب کے سلسلے میں جو بحث کی گئی ہے وہ خاص طور سے قابلِ ستائش ہے۔ مجاز نے اپنی مشہور نظم ''انقلاب'' میں انقلاب کے جن مختلف مراحل پر زور دیا تھا ان کی نشاندہی اس سے قبل کسی نے نہیں کی تھی۔ اس بحث کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ مجاز پہلے شاعر تھے جنہوں نے اردو شاعری کو انقلاب کا ایک جاندار اور صحت مند تصور عطا کیا۔ نیز یہ کہ اس معاملے میں اُن کے جوش سے متاثر ہونے یا ان کے تصور انقلاب سے متعلق تمام تر اعتراضات بہت ہی بے جان اور سطحی نوعیت کے ہیں۔

کچھ ترقی پسند ناقدین مثلاً احتشام حسین، محمد حسن، مجتبیٰ حسین ایسے بھی ہیں جو مجاز کے تصور انقلاب سے اتفاق نہیں رکھتے۔ اِن حضرات کا یہ کہنا ہے کہ مجاز کے تصور انقلاب میں تخریب کے پہلو زیادہ، تعمیر کے پہلو کم ہیں۔ پروفیسر اسلوب احمد انصاری کا نقطۂ نظر ترقی پسند نہیں ہے بلکہ وہ غیر ترقی پسند ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ مجاز کے انقلابی تصور کی سخت لہجے میں

تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> مجاز کی بیشتر انقلابی نظمیں اعلیٰ اور کامیاب شاعری پر پوری نہیں اترتیں کیونکہ اُن نظموں میں وہ شاعر کے منصب کا احترام کم کرتے ہیں انقلاب کا ڈھنڈورہ زیادہ پیٹتے ہیں۔ مجاز کا انقلاب کا تصور سراسر جذباتی ہے جو صرف ایک بے معنی تخریب پر مبنی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کو انقلاب کا جو تصور جوش نے دیا تھا اسے مجاز نے بغیر کسی تنقیدی محاکمے کے قبول کرلیا ہے۔

مجاز کے تصور انقلاب پر مزید گفتگو کرنے سے پہلے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اُن کے اس تصور انقلاب سے متعلق چند مختلف اشعار کو پیش کردوں تا کہ اُن کے اس تصور انقلاب کو واضح کرنے میں آسانی ہو۔

ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

گر پڑیں گے خوف سے ایوانِ عشرت کے ستوں
خون بن جائے گی شیشوں میں شرابِ لالہ گوں
جھونپڑوں میں خوں، محل میں خوں، شبستانوں میں خوں
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں

انقلاب کی آمد پر وہ کہتے ہیں:

کوہساروں کی طرف سے سرخ آندھی آئے گی
جابجا آبادیوں میں آگ سی لگ جائے گی
توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں کے اسیر

پھر کہتے ہیں:

اس طرح لے گا زمانہ جنگ سے خونی سبق
آسماں پر خاک ہوگی فرش پر رنگِ شفق
اور اِس رنگِ شفق میں یا ہزاروں آفتاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

اپنی ایک نظم ''سرمایہ داری'' میں سرمایہ دارانہ نظام کے معاشی استحصال اور دوسرے غلط رجحانات کو وہ کچھ اس طرح بے نقاب کرتے ہیں:

یہ اپنے ہاتھ میں تہذیب کا فانوس لیتی ہے
مگر مزدور کے تن سے لہو تک چوس لیتی ہے
غریبوں کا مقدس خون پی پی کر بہکتی ہے
محل میں ناچتی ہے رقص گاہوں میں تھرکتی ہے
یہ اکثر لُوٹ کر معصوم انسانوں کو راہوں میں
خدا کے زمزمے گاتی ہے چھپ کر خانقاہوں میں

اور آخر میں اس خیال کا اظہار بھی ملتا ہے:

گرجتی گونجتی یہ آج بھی میداں میں آتی ہے
مگر یہ ست ہے ہر ہر قدم پر لڑکھڑاتی ہے
مبارک دوستوں لبریز ہے اب اس کا پیمانہ

اِن تمام اشعار کی روشنی میں مختصراً صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجاز کے تصورِ انقلاب کو سطحی، تخریبی اور معمولی تصور کر لینا یہ اُن کی شاعری کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا اس لیے کہ مجاز کی زیادہ تر انقلابی نظمیں دوسری عالمی جنگ کے خاتمے سے قبل لکھی جا چکی تھیں، یہ وہ دور تھا جب زیادہ تر پڑھے لکھے لوگ اشتراکی نظریات سے قریب ہو رہے تھے۔ مجاز بھی اشتراکیت سے قریب تھے اور کمیونسٹ پارٹی کی سیاست سے جذباتی طور پر وابستہ تھے۔

ہندستان کے آس پاس کی انقلابی سرگرمیوں پر بھی مجاز کی نظر تھی۔ روس اور چین میں انقلابی جدوجہد جاری تھی۔ لہٰذا مجاز کا تصورِ انقلاب وہی تھا جو اُس زمانے میں ایک خاص انداز سے سوچنے والے نوجوانوں اور کمیونسٹ پارٹی کا تھا۔ اور ان تمام اعتراضات کا جواب وہ اپنی نظم ''انقلاب'' میں دے چکے ہیں۔ آخر میں میں منظر سلیم کی کتاب ''مجاز حیات اور شاعری'' کے اقتباس پر اپنے مقالے کو ختم کروں گا۔ تاکہ میرا نقطۂ نظر پوری طرح سے واضح ہو سکے۔

> آج کے ان حالات کے پس منظر میں مجاز کے تصورِ انقلاب کو تخریبی قرار دینا آسان ہے لیکن ۳۰ سے لے کر ۴۵ عیسوی تک کے حالات تصورات اور رجحانات کی روشنی میں مجاز کے تصورِ انقلاب کا جائزہ لیا جائے تو ان پر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ مجاز نے جس عہد میں انقلابی نظمیں لکھیں اُس وقت ملک کے خاصے بڑے حلقے میں انقلاب کے لیے مسلح بغاوت کا نظریہ سب سے زیادہ ترقی پسند سیاسی نظریہ تصور کیا جاتا تھا اور مجاز نے ایک حساس اور باغی جوانوں کے افکار اور خیالات کی ترجمانی کی۔ ظاہر ہے مسلح تصادموں جو ملک گیر پیمانوں پر ہوتے ہیں بہت بڑے پیمانے پر تباہی و بربادی بھی آتی ہے۔ قتل و غارت گری کے بازار گرم ہوتے ہیں۔ جھونپڑوں اور محلوں میں آگ لگتی ہے۔ کھیت اور کھلیان اجڑتے ہیں اور گھر سے لے کر میخانے تک انسانی سکون کے تمام مرکز خون کی ندیوں کی زد میں آجاتے ہیں۔ ان تمام امور کے سلسلے میں مجاز کا تصور وہی ہے جو اس زمانے میں ہر پڑھے لکھے اور کمیونسٹ پارٹی سے جڑے نوجوان کا تھا۔

https://www.urdubooks.acw-614.com

مَیں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں